

نئے بنگالی افسانے

نئے بنگالی افسانے

ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان کراچی

(قیمت دو روپے)

پیش لفظ	الطاف گوہر	۵
بجلی	مبین الدین احمد	۱۳
سیلاب	ابوالکلام شمس الدین	۳۰
سڑک	ابوالکلام شمس الدین	۵۳
ڈاکٹر مارنو	محی الدین	۷۰
کٹا ہوا چاند	سید ولی اللہ	۸۸
اصول کی خاطر	سکندر ابوجعفر	۱۰۱
چھتری	علاء الدین الآزاد	۱۱۴
شریف	ابوالفضل	۱۳۵
تین زاویے	ابورُشد	۱۴۷
گُلِ نیلوفر	شوکت عثمان	۱۶۵

پیش لفظ

بنگلہ زبان کے مختصر افسانوں کا یہ انتخاب تعارفی نوعیت کا ہے۔ اس انتخاب میں جن لکھنے والوں کے افسانے شامل ہیں وہ مشرقی بنگال کے ادبی حلقوں میں ویسے ہی معروف ہیں جیسے ہمارے ہاں ممتاز مفتی انتظار حسین، اے حمید اور اسی سن وسال کے اور لکھنے والے۔ ان افسانوں میں آزادی کے بعد کی معاشرتی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور ذہن ان سماجی مسائل اور شخصی الجھنوں سے دوچار ہوتا ہے جو مشرقی بنگال کے نوجوان دلوں اور دماغوں کو بیتاب کئے رہتی ہیں مشرقی بنگال کے سماجی مسائل میں جو چیز سب سے اہم ہے وہ افلاس اور غریبی کا احساس ہے۔ علاء الدین الآزاد نے اپنے افسانے "چھتری" میں اس احساس کی بڑی ہی موثر اور پُرزور ترجمانی کی ہے، افسانے کے مرکزی کرداروں کی بے چارگی اور ماحول کی بپھری ہوئی لہروں کی پُردرد کشمکش اس چیخ میں ڈوب کر رہ جاتی ہے "صرف

نالہ و فریاد، آہ و فغاں اور کچھ نہیں، یہ بھی سوچا کہ دنیا کا پہیہ کس انداز سے گھوم رہا ہے'' یہ بات ایک ایسے آدمی نے کہی ہے جو سماج کے ایک ادنیٰ طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور جس کی مختصر اور محدود زندگی کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ وہ کس طرح ایک ہی چھتری تلے اپنے لئے اور اپنے بچّوں کے لئے پناہ کا سامان مہیا کر سکے. اس کوشش میں جب وہ ناکام ہو کر دم توڑنے لگتا ہے تو اُسے اپنی بیوی کی آہ و فغاں " خدایا مَیں کیا کروں، ان سارے بچّوں کو لے کر کیا کروں گی. یہ چھوٹے چھوٹے بچے معصوم اور بے بس، کہاں جاؤں، کس کے سامنے فریاد کروں؟" انتہائی سطحی اور بے معنی معلوم ہوتی ہے. اس لئے کہ اس آہ و فغاں میں محض اپنی ذات کا احساس شامل ہے، اُس کی بُجھتی ہوئی آنکھیں جو "صِرف چراغ کی لَو کو دیکھ رہی ہیں" ذات کی حدود سے نکل کر اُس بیدرد گردش میں کھو جاتی ہیں جو ہَولے ہَولے مگر چُن چُن کر سب کو پیستی چلی جاتی ہے۔

افلاس ہی کے احساس سے متعلق محی الدین کا افسانہ 'ڈاکٹر مارنو' ہے۔ اس افسانہ میں فرد کی بیچارگی کے ساتھ ساتھ مسرت کی لاحاصل تلاش کا ایک دلکش اور ڈرامائی نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

بدلتی ہوئی سماج کی ایک تصویر ابوالکلام شمس الدین کے افسانے "سڑک" میں ملتی ہے. افسانے کا موضوع نئے اور پُرانے کی ابدی اُلجھن ہے۔

افسانہ نگار نے گوہر علی کا کردار انتہائی ہمدردی اور فنی اعتبار سے بڑے یقین اور خلوص کے ساتھ تعمیر کیا ہے۔ گوہر علی اپنی زمین دے کر گاؤں کو شہر سے ملانے کے لئے سڑک بنانے میں مدد دیتا ہے، وہ سڑک جسے گاؤں والے ایک نئی زندگی کا راستہ سمجھ لیتے ہیں۔ اس سڑک سے جہاں گاؤں والوں کی زندگی میں خوش حالی کا دور آ گیا اور ان کی وہ "بے نام بوٹیاں اور پتے وغیرہ بھی جو گاؤں میں بے تحاشہ اُگتے تھے، شہر میں دھڑا دھڑ بکنے لگے" وہاں "دیوانی اور فوجداری عدالتوں کی طرف آمدورفت بھی شروع ہو گئی دیہاتیوں کی سیدھی سادی زندگی میں سازش اور مکاری بھی شامل ہو گئی، سڑک کے دونوں طرف کتنے ہی گلی کوچے بن گئے جن میں خدا جانے کتنے ہیر پھیر تھے۔"

وہ رومان جو گاؤں کی زندگی کی جان تھا رفتہ رفتہ مٹ جاتا ہے۔ گوہر علی نئے اور پرانے دور اہے پہ کھڑا یہ تماشہ دیکھ رہا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنا سب کچھ کھو بیٹھتا ہے۔ وہ احتجاج جو اس کے سینے میں ایک خاموش اور بے نام انداز سے سُلگ رہا تھا آخر بھڑک اُٹھتا ہے۔ "وہ دفعتہ دیوانہ وار باہر نکلا، ہاتھ میں کُدال اٹھائی اور سڑک کے اس حصّے کی طرف بھاگا جس کے لئے اس نے اپنی زمین کی بھینٹ دی تھی" اور جب لوگ اُس سے پوچھتے ہیں "ارے گاؤدی یہ کیا کر رہا ہے؟" تو وہ کُدال سے تابڑ توڑ چوٹیں برساتے ہوئے کہتا ہے "اس سڑک کا صفایا کر رہا ہوں۔"

اس انتخاب میں تین افسانے ایسے ہیں جن سے بنگلہ کے نوجوان ادیبوں کا معاشرت کی خارجی اُلجھنوں کی طرف نقطۂ نظر کا پتہ چلتا ہے۔ یہ اُلجھنیں وہ ہیں جن کا ہر بدلتے ہوئے دور میں ادبی ذہن کو سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کی نوعیت ایک حد تک روایتی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ ابوالفضل کے افسانے "شریف" میں سہاگی کا والد محض پردے کی روایت کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی بیٹی کو ایک حادثہ کی نذر کر دیتا ہے، اسی طرح اسکندر ابو جعفر کے افسانے "اصول کی خاطر" کا ہیرو اپنی جان دے کر اپنے باپ کی آن کا بھرم رکھ لیتا ہے۔ ابو رشد کے افسانے "تین زاویئے" میں دو دوست، جن میں سے ایک امیر ہے اور دوسرا غریب، علامتوں کے طور پر غریبی اور امیری کی سماجی کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان افسانوں میں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ بنگلہ زبان کے نوجوان ادیبوں کا ان روایتی سماجی مسائل کی طرف ردّ عمل بنیادی طور پر انتہائی صحت مندانہ اور نارمل ہے۔ ولی اللہ کا افسانہ "کٹا ہوا چاند" بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔ مگر تکنیک اور مشاہدہ کے اعتبار سے اس کی حیثیت ان افسانوں سے کسی قدر الگ ہے، افسانہ میں دیہات کی گھریلو زندگی کے چند مناظر نہایت کامیابی سے بیان کئے گئے ہیں۔

محبت کے موضوع پر اس انتخاب میں دو افسانے شامل ہیں۔

معین الدین احمد کا افسانہ "بجلی" اور ابوالکلام شمس الدین کا افسانہ "سیلاب"۔ موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے "بجلی" جدید ترین بنگلہ افسانوں کی ایک اچھی مثال ہے اور اس میں افسانہ نگار نے بڑی گہری نظر سے اپنے موضوع کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کیا ہے

اس انتخاب کے افسانوں کا موضوع مجموعی طور پر زندگی کا کوئی گہرا اور پرانا مسئلہ ہے، افلاس، اور امارت، نئی اور پرانی قدروں کی کشمکش، حقیقی مسرت کی جستجو، ان افسانوں میں زندگی کے کسی مخصوص پہلو کو مشاہدہ کی جزئیات یا نفسیات کے تجزیہ کی مدد سے اُجاگر نہیں کیا گیا بلکہ عام زندگی کے کسی جانے پہچانے مسئلے کو لے کر کرداروں کے طریقِ عمل اور اندازِ نظر سے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان افسانوں کے بشیر کردار علامتوں کی طرح ہیں۔ ان علامتوں کی بنیاد روایتی ہے مگر اس کے باوجود افسانہ نگار اپنی فطری ہمدردی کے زور سے انہیں ایک زندگی عطا کر دیتا ہے۔ "بجلی" کی ہیروئین "گلنانی" جہاں اس نقطۂ نظر کی علامت ہے جو سماجی بندشوں اور اُن بندشوں میں گھُٹے ہوتے سکون کو فرد کی ذہنی آزادی اور اضطراب کے مقابل ہیچ سمجھتا ہے، وہاں وہ ایک جیتی جاگتی شوخ اور اکھڑ لڑکی بھی ہے جس کی کشش اور گداز سارے افسانے کی جان ہے۔

اِن افسانوں کو جو بات اس دَور کے دوسرے افسانوں سے ممتاز

کرتی ہے وہ ان کا لہجہ ہے اور یہ لہجہ بنگلہ مزاج اور ماحول کا خاصّہ ہے۔ اس لہجہ میں ایک گہری تھکن اور اداسی کا احساس شامل ہے۔ یہ خیال کہ زندگی کسی انجانی منزل کی طرف رواں دواں ہے اور فرد اس کی راہ میں ایک بے مایہ سی چیز ہے جس کی حیثیت ایک رکاوٹ سے زیادہ نہیں، اس مغموم لہجے کا فلسفیانہ جواز ہے، جن افسانوں میں اس خیال کو پوری طرح سے قبول کرلیا گیا ہے۔ اُن کا اختتام ایک پُرسکون مگر انتہائی یاس انگیز انداز میں ہوتا ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے افسانہ نگار مسئلہ کو پورے خلوص سے بیان کر دینے کے بعد اُسے کسی طرح حل کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس لئے کہ اُسے یقین ہے کہ وہ کوشش لاحاصل ہوگی۔ "چھتری" اس خیال کی ترجمانی کی ایک مثال ہے۔ جہاں کہیں افسانہ نگار مسئلہ کو حل کرنا چاہتا ہے وہاں افسانے کا انجام یا میلوڈرامائی رنگ اختیار کرلیتا ہے یا کسی حادثہ کی شکل میں رُونما ہوتا ہے، جیسے "شریف"، "سیلاب" اور "اصول کی خاطر" میں۔

ان افسانوں کی ہیئت اور تکنیک میں ایک دلکش سادگی ہے۔ جو بات کہی جاتی ہے براہ راست اور بغیر کسی بل و پیچ کے اور یہ سادگی لہجہ کی گہری افسردگی کی طرح مشرقی بنگال کے مزاج کی خصوصیت ہے۔ بعض دفعہ تو یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے افسانہ نگار ایک مصور کی طرح پہلے بنیادی خطوط سے تصویر کا خاکہ تیار کرتا ہے اور پھر ان میں سے ہر ایک خط کو اُبھار کر اُس

خاکہ کو زندہ و جاوید بنا دیتا ہے۔ افسانہ نگار نے "بجلی" میں گلتانی کا کردار یوں تعمیر کیا ہے:۔

"گلتانی کالی ہے

"صرف کالی کہنا کافی نہیں بلکہ آبنوس کی طرح کالی ہے، مگر بدصورت نہیں، اس کی صورت میں بڑی دلکشی ہے۔

"گلتانی گویا کسی ماہر سنگتراش کی مدت کی مشق و ریاض کا نتیجہ ہے، اس کا مخمل سا حسین ملائم جسم، ناک نقشہ، آنکھیں اور بال سب کے سب اپنا جواب آپ ہیں، بدن میں ناموزونی کہیں نام کو نہیں۔ کہیں بھی ذرا سا داغ یا ناہمواری نہیں، صرف ہنستی ہے تو گالوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں۔"

افسانہ نگار نے بڑی چابک دستی سے ان چند الفاظ میں ایک جیتا جاگتا کردار جس کے دل کی دھڑکن تک ہم محسوس کر سکتے ہیں، اُبھار کر ہمارے سامنے رکھ دیا ہے، پہلا جملہ "گلتانی کالی ہے" مصور کے بنیادی خط کی طرح ہے، دوسرے جملوں میں اس بنیادی خط کو اُبھارنے کے لئے گلتانی کے جسم کو "آبنوس" سے اور اس کی جلد کو "مخمل" سے تشبیہ دے کر چند اور سیدھے سادے خطوط کھینچ دیئے گئے ہیں، اور تصویر یہ کہہ کر کہ "ہنستی ہے تو گالوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں" مکمل کر دی گئی ہے۔

اس انتخاب کے افسانوں سے اُردو پڑھنے والوں کو مشرقی پاکستان کے نوجوان ادبی ذہن سے آشنا ہونے کا موقع ملے گا۔ ایسا موقع بہم پہنچانا ایک قابلِ قدر خدمت ہے اس لئے کہ اس دور میں جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ایک دوسرے کی ذہنی اُفتاد طبعی میلانات اور جذبات کو سمجھنے کی ہے۔ مستقبل کی بھرپور اور ہمہ گیر روایتوں کی تعمیر اسی باہمی "تفہیم" کی مدد سے کی جا سکتی ہے۔

الطاف گوہر

ڈھاکہ

(نومبر ۱۹۵۵ء)

مبین الدین احمد
مترجمہ: فیض احمد چودھری

بجلی

سعید پور مشرقی پاکستان کا ایک گمنام گاؤں ہے۔ گاؤں بھر میں ان پڑھ کسان ہی بستے ہیں۔ بہت دن پہلے فقط ایک شریف گھرانا یہاں بستا تھا جو اس پرگنے کا زمیندار بھی تھا۔ اب زمینداری غیروں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اس زمیندار خاندان کا ایک ہی چشم و چراغ رہ گیا ہے —— وہ بھی بائیس تیئیس سال سے پردیس گیا ہوا ہے اور ایک دن کے لئے بھی یہاں نہیں آتا۔ (اب یہاں) ان کی کھوئی ہوئی عظمت کی آخری نشانی صرف اس عالیشان عمارت کا کھنڈر باقی ہے جو بھوتوں اور جنّات کا مسکن معلوم ہوتی ہے۔

(۲)

گلتانی اس غیر مشہور گاؤں کے غریب کسان شیخ بدار کی اکلوتی بیٹی ہے

طبیعت میں اس کی شوخی اور اچپلاہٹ ہے۔ نہ کسی سے ڈرتی ہے اور نہ اُسے کسی بات کی پروا۔ سارے طور طریق بالکل لاؤ بالی۔ اس کا اصلی نام کریمن تھا مگر یہ نام اب کسی کو یاد نہیں۔ فطری عادات واطوار کی مناسبت سے اس کا نام گلتانی پڑگیا ہے۔

بچپن ہی میں اس کی شادی ہو چکی تھی۔ کوئی پانچ سال ہوئے شوہر کا انتقال ہو گیا گلتانی اس وقت دس گیارہ سال کی تھی۔

آج وہ بھرپور جوانی کی آغوش میں ہے۔

(۳)

گلتانی کالی ہے

صرف کالی کہنا کافی نہیں، بلکہ آبنوس کی طرح کالی ہے مگر بدصورت نہیں۔ اس کی صورت میں بڑی دلکشی ہے۔

گلتانی گویا کسی ماہر سنگتراش کی مدت کی مشق وریاض کا نتیجہ ہے۔ اس کا مخمل سا حسین ملائم جسم، ناک نقشہ، آنکھیں اور بال سب کے سب اپنا جواب آپ ہی ہیں۔ بدن میں ناموزونی کہیں نام کو نہیں۔ کہیں بھی ذرا سا داغ یا ناہمواری نہیں۔ صرف ہنستی ہے تو گالوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں۔

(۴)

گلتانی کے نادر حسن کو پرکھنے والی آنکھ اس گاؤں میں نہیں، یہ

بات تو یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے مگر اس کے گالوں کے گڑھے پر سب کی نظر پڑتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ گال کا گڑھا نحوست کی نشانی ہے کہتے ہیں ایسی عورتوں کے شوہر زندہ نہیں رہتے۔ گلنانی کے بیوہ ہونے پر سب کے دل میں یہ وہم اور بھی راسخ ہو گیا۔

سب لوگ کہتے ہیں زندگی میں اسے اور کوئی خوشی نصیب نہ ہوگی۔۔۔۔۔۔ ہنستے وقت اس کے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں۔

اگرچہ اس کے حسن و زیبائی کو کوئی نہیں دیکھتا اور اس کے گال میں منحوس گڑھے بھی پڑتے ہیں پھر بھی گلنانی کی سرشار جوانی بہت سے لوگوں کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ وہ ہر وقت بڑے سلیقے سے بن ٹھن کے رہتی ہے۔ خوشحال شیخ مدار کی اکلوتی بیٹی بدنصیب ہے تو کیا، باپ کی لاڈلی تو ہے۔ رنگین لباس پہن کے اور چوٹی میں کوئی پھول گوندھ کے وہ محلے میں سیر کو نکلتی ہے۔۔۔ کسی کی روک ٹوک کو وہ سنتی ہی نہیں۔

(۶)

عجیب لڑکی ہے گلنانی

سب کے سامنے نکل آتی ہے، بات کرتی ہے، اور موقع بے موقع ہنسی میں جھومنے لگتی ہے، لچک چال ہے۔ گلنانی کی حرکاتِ جسمانی، ناز و ادا، طور طریق اور بات چیت میں ایک ایسا شور انگیز، پُرمعنی اور لطیف اشارہ

ہوتا ہے کہ بے ساختہ دل کو لبھاتا ہے مگر ہاتھ بڑھاؤ تو گلتانی تک نہیں پہنچتا، گویا کہیں اٹک کے رہ جاتا ہے۔

جیسے وہ بلّور کی شفّاف اور سخت دیوار کی اوٹ چلتی پھرتی ہو — نظر سب کچھ آتا ہے مگر اسے کسی طرح چھوا نہیں جا سکتا۔

(۷)

گلتانی صرف ایک ہی شخص سے ذرا جھینپتی ہے اور اس کا لحاظ بھی کرتی ہے۔ گنجر بائیس تیئیس سال کا ہٹا کٹا نوجوان ہے۔ سر پر گھونگھر والے بال۔

گنجر کے سامنے گلتانی کا اونچا سر خود بخود نیچا ہو جاتا ہے — سینے کے اندر دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔

گنجر گلتانی کو "گل" کہہ کے پکارتا ہے اور کبھی کبھی "گلّی"

(۸)

مرآد مصور

ایک زمانے میں اسے اپنی فنکاری پر بڑا ناز تھا۔ اب مصوری اس کا پیشہ ہے۔ باپ کے جیتے جی مرآد کو فن کی تحصیل کا چنداں موقع نہ مل سکا۔ دولتمند باپ کا اکلوتا بیٹا معمولی مصور یا نقّاش نہیں ہو سکتا۔ اسے تو جج یا مجسٹریٹ ہونا چاہیئے۔ باپ کی خواہش لے دے کے بس اتنی تھی۔ مراد کے باپ کے نزدیک دستکار اور نقّاش میں کوئی فرق نہ تھا گھٹیا

چیز کوئی بڑا نام دینے ہی سے شاندار نہیں بن جاتی۔

مُراد کے باپ کی رائے ایسی پختہ تھی کہ اسے بدل دینے کی طاقت مُراد میں نہ تھی لیکن مراد کی فطری صلاحیت باپ کی مرضی کے مطابق کام نہ کرسکی۔ باپ بیٹے کی ان متضاد خواہشوں میں برابر کشمکش جاری رہنے کی وجہ سے مراد نے ٹھوکریں کھاتے کھاتے کسی طرح بی۔ اے تو پاس کرلیا مگر جج یا مجسٹریٹ نہ بن سکا۔

ماں بہت دن پہلے مرچکی تھی، باپ کے انتقال کے بعد دنیا میں اس کا اپنا کوئی نہ رہا۔ گاؤں کے عالیشان مکان کے سوا مراد گاؤں کی ساری جائداد بیچ کر پیرس روانہ ہوگیا۔

فن کے سیکھنے میں لگاتار ریاض کے ساتھ ساتھ مراد نے پیرس میں اور بھی بہت سی باتیں سیکھ لیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارا روپیہ اُڑا دینے میں اسے چند سال سے زیادہ نہ لگے اور جب وطن واپس آیا تو بالکل خالی ہاتھ تھا۔

(۸)

اتنی مدت تک گاؤں کی اس موروثی عمارت کا اسے خیال ہی نہ آیا تھا۔ وطن واپس آنے کے چند روز بعد ایک دن یکایک اس کے دل میں آیا کہ گاؤں کی اس عمارت کے بیچنے سے کئی ہزار روپیہ ہاتھ آئے گا اور جب تک روزگار کی کوئی اچھی سبیل نہ نکلے اس وقت تک تنگدستی اور فکرِ معاش

سے نجات ملے گی۔

اس کے بیچنے میں کوئی دِقت بھی اسے نظر نہیں آتی تھی۔ برابر کے گاؤں کے جن لوگوں نے اس کی دوسری جائداد خریدی تھی ان میں سے جس کو بھی یہ عمارت مل جائے وہ خوش ہی ہوگا۔

(۹)

گاؤں میں گلتانی کے ناکام چاہنے والوں کا ایک گروہ تھا جو گلتانی سے انتقام لے کر اپنا جی ٹھنڈا کرنے کا موقع ڈھونڈھ رہا تھا۔ موقع ایک دن خود بخود ہی پیدا ہو گیا۔ شیخ سمیر گاؤں کا مکھیا تھا۔ گاؤں میں اس کا بڑا اثر تھا۔ شیخ سمیر کی پچاس سال کی عمر تھی جب اس کی تیسری بیوی دو تین چھوٹے چھوٹے بچّے چھوڑ کر مر گئی تو سبھوں نے اسے گلتانی سے شادی کرنے کا مشورہ دیا۔

—— "گلتانی ہی سے نکاح کر لو پردھان —— دیکھو گے کہ وہ تمہارا گھر بار کس طرح سنبھال لیتی ہے! اس کا گھمنڈ بھی کم ہو جائے گا...... گاؤں کے لونڈے بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔"

مکھیا نے کہا: "گلتانی کے تو گاؤں میں گڑھے پڑتے ہیں۔ کیا اس سے شادی کر کے میں وقت سے پہلے ہی مر جاؤں؟"

—— "تم کیوں مرنے لگے چودھری! اس سے شادی کرنے میں کوئی خرابی نہیں۔

اس کا شوہر مرا۔ تمہاری بیوی مری ...... نحوست کا چکّر تو ختم ہوا۔"

پردھان نے کہا: "بات تو تم نے ٹھیک کہی .... اچھا میں اسی سے نکاح کر لوں گا۔ دیکھنے میں وہ خاصی اچھے ہاتھ پاؤں کی ہے۔"

چودھری کے چہرے پر ہنسی کی ہلکی سی لہر داڑھی مونچھوں کے جنگل کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔

مگر گلتانی نے چودھری کا پیغام بے دھڑک رَد کر دیا۔ جو شخص پیغام لے کے آیا تھا اس سے کہا اپنے پردھان سے کہہ دینا کہ گلتانی کو گلے میں پھانسی ڈالنا منظور ہے مگر اس بُڈھے کھُوسٹ کا گھر آباد نہیں کرے گی۔

گلتانی کی ماں نے مارے ڈر کے ٹوکا کہ بات تو سُن حرام زادی! اری! یہ تیری قسمت جاگی ہے کہ چودھری تجھ سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔ چودھری کے پاس دھن دولت، زمین سبھی کچھ ہے۔ تیرے دل میں آخر ہے کیا؟

گلتانی نے ناک بھوں چڑھا کے کہا: ایسے روپے پیسے اور زمین پر جھاڑو پھیرتی ہوں۔

جو شخص یہ پیغام لے کے آیا تھا وہ گلتانی کا مُنہ بولا دُولہا بھائی تھا۔ اس نے ذرا چھیڑ خانی کی کہ بُوڑھا کتنا پیار کرے گا تمہیں۔ دیکھنا پیچھے پیچھے پھرے گا جیسے پالتو کُتّا۔

دُولہا بھائی نے زور کا قہقہہ لگایا۔

گلستانی نے کہا: تو پھر کہہ دینا کہ ویسا ہی ایک جانور ڈھونڈھ لے، اپنے لئے — میرے پیچھے کیوں پڑا ہے۔

زیادہ بات کی ضرورت نہیں۔ وہ شخص واپس چلا گیا۔

(۱۲)

یہ باتیں سُنکر شیخ سمیر بھڑک اُٹھا، اتنی بڑی بات! گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے کہا: دماغ دیکھا لونڈیا کا؟ تم اس کا کوئی علاج کرو چودھری، کوئی ترکیب نکالو۔

گلستانی کے ناکام عاشقوں نے کہا: گلستانی کے رنگ ڈھنگ بُرے اور چال چلن خراب ہے۔ رات کو تالاب کے کنارے اکیلے میں وہ اور گنجر ایک دوسرے کی بغل میں بیٹھ کے پریت کے گیت گنگناتے ہیں۔

مُکھیا نے کہا: ہائیں! اچھا مزا چکھاتا ہوں میں، ٹھہرو!

(۱۳)

گاؤں میں پنچایت بیٹھی ہے۔

گلستانی کا مقدمہ در پیش ہے۔

گلستانی اپنے خلاف الزامات سُنکر آگ بگولا ہو گئی۔ "ایسی جھوٹی بات نہ کہو، چودھری۔ مجھ پر جو ایسا طوفان اُٹھائے گا وہ کوڑھی ہو جائے گا۔"

مُکھیا ہنسا اور کہا: "وہ تو دیکھا جائے گا بعد میں — اب ناپ کے

دو ہاتھ زمین سے ناک رگڑ! آئندہ کسی دن تجھے گنجر کے پاس بیٹھے دیکھا تو سخت سزا ملے گی، سمجھی؟"

گنجر اب تک مجلس کے ایک کونے میں خاموش بیٹھا تھا۔ یک بیک اُٹھ کر بولا: تمہیں سزا دینی نہیں پڑے گی پردھان ـــ مَیں اس سے شادی کر لوں گا۔

مجلس پر بجلی سی گری۔ گلستانی نے گنجر پر ایک نگاہ ڈال کے آنکھیں نیچی کر لیں۔ ساری مجلس ہکا بکا رہ گئی۔

مُکھیا نے گرج کر کہا: "شادی کر لوں گا، مُنہ سے کہہ دیا اور ہو گئی شادی"۔

ـــ "کیوں، شادی پر تمہیں کیا اعتراض ہے؟"

ـــ "اعتراض! اعتراض تو بڑا بھاری ہے! مگر وہ ہم تمہیں بتائیں گے نہیں، گنجر!"

گنجر خاں چلّا اُٹھا "بتاؤ گے کیسے نہیں۔ بتانا پڑے گا۔"

ـــ "اچھا رے۔ اتنی بڑی بات! مار حرام زادے کو"

آن کی آن میں بہت سے مخالف ہاتھ گھونسے تان تان کے اُٹھے اور گنجر پر پِل پڑے۔

ایک خوفناک ہُلّڑ اور شور وغل میں مجلس برخاست ہو گئی۔ اگلے دن معلوم ہوا کہ گنجر گاؤں چھوڑ کے شاید کہیں چلا گیا۔ گلستانی بالکل

گُم سُم رہ گئی۔

(۱۴)

مُراد بہت دنوں کے بعد گاؤں میں آیا ہے اُس کا عاشقِ فن دل گاؤں کے ہر منظر پر لوٹ ہے۔ سارے دن وہ بڑے شوق اور انہماک سے تصویریں کھینچتا ہے۔

کل جو لوگ اس کی رعیت تھے آج وہ اوروں کی پرجا ہیں، تب بھی پُرانی رعیت میں سے ایک، ایک کر کے بہت سے لوگ پُرانے آقا کی اولاد سے ملاقات کرنے آئے۔ کوئی شخص اس سے زیادہ بات نہیں کرتا —— شاید ہمت نہیں پڑتی —— پھر بھی جو آتا ہے، سلام کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔

مُراد انسانی صحبت کی کمی کو قدرتی مناظر کی زیبائی اور دلفریبی سے پورا کر لیتا ہے۔ گاؤں اسے بے حد بھلا لگ رہا ہے۔

(۱۵)

مراد تصویر کھینچ رہا ہے:

بَل کھاتی ہوئی ندی کہیں نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ چھوٹی بڑی طرح طرح کی ناویں ایک کے بعد ایک بہی چلی جا رہی ہیں۔

اُس پار جہاں تک نظر جاتی ہے دھان کا ہرا کھیت ہے۔ اس پار کھنڈرات میں ایک ٹوٹا پھوٹا محل۔

کتنی حسین تصویر! سب گویا سچ مچ کے باغ ـــــ سچ مچ کے درخت!
کتنی خوبصورت چھوٹی چھوٹی نالیاں ـــــ جیسے بالکل اصلی! ناریل کا درخت
ـــــ ناریل! واہ وا ...... ! مُراد تصویر سے نظر اُٹھا کر حیران رہ گیا۔
پندرہ سولہ سال کی ایک لڑکی ...... رنگ کالا، مگر جسم بے عیب، نہایت
متناسب جس میں عنفوانِ شباب کی بھرپور بہار ہے۔ ڈھیر کے ڈھیر کالے
بالوں کی بھاری بھرکم چوٹی ـــــ دھاری دار رنگین ساری میں لپٹی ہوئی
پتلی کمر۔ بڑی بڑی بادامی آنکھوں میں حیرت بسی ہوئی۔ ان باتوں نے
مُراد کا دل موہ لیا۔

ـــــ "تمہارا نام؟"

ـــــ "گلستانی ......"

ـــــ "گلستانی! نام تو بہت پیارا ہے۔"

گلستانی نے کہا: "جیسے آپ خوبصورت ہیں ویسی ہی سُندر تصویر
بھی کھینچی ہے۔"

مُراد نے کہا: "مَیں کیا بہت خوبصورت ہُوں؟"

ـــــ "بیشک! کتنا سُندر ہے آپ کے بدن کا رنگ ...... گورا، گورا،
خُوب صُورت۔"

ـــــ "تم بھی سُندر ہو ...... مجھ سے کہیں زیادہ"، گلستانی مُسکرائی۔ گالوں

میں گڑھے پڑ گئے۔

گلستانی نے کہا: میں تو کالی ہوں۔

—"کالی ہو اسی لئے تو اور بھی خوبصورت لگتی ہو۔ تمہارا جسم، ناک، آنکھیں، چہرہ، بال، "ٹول" (گال کا گڑھا) سب مل ملا کے بے مثال ہو تم۔

— "ٹول"؟ ٹول کیا؟

— تم جب ہنستی ہو تو تمہارے گال میں جو ......

...... اوئی! ہنستے وقت گال میں گڑھے پڑ جانا؟

گلستانی کھلکھلا کے ہنس دی، کیا اسے "ٹول" کہتے ہیں؟

گلستانی پھر ہنسی۔

...... ہنسیں کس بات پر؟

...... آپ کی بات سُنکر۔ بڑا پیارا لفظ ہے ...... "ٹول"

...... فقط لفظ ہی پیارا نہیں ...... وہ خود بھی بہت پیارا ہے۔

گلستانی نے آنکھیں نیچی کر کے کہا: ہنستے وقت جن لڑکیوں کے گال میں گڑھے پڑ جاتے ہیں وہ تو بدنصیب ہوتی ہیں ...... شوہر ان کے زندہ نہیں رہتے۔

— کون کہتا ہے؟

—— سب ہی کہتے ہیں ...... میں بھی جانتی ہوں۔

—— غلط، بالکل جھوٹ۔ گال میں "ڈول" تو چھچھورے پن کی علامت ہے۔

...... ایسی لڑکیاں پتی کو بہت پیاری ہوتی ہیں۔

مُراد ہنسا ——

گلستانی کی بڑی بڑی آنکھیں خاموش مُراد کا مُنہ دیکھتی رہیں۔

(۱۶)

سعید پور گاؤں کا گاؤں مشتعل ہو گیا ہے۔ گاؤں والے سب بپھرے ہوئے ہیں۔ نشانہ مُراد ہے۔ رات کے ایک بجے ——

مُراد بستر پر چُپ چاپ پڑا ہے۔ آنکھوں میں نیند نہیں۔ گھر کے کونے میں شمع جلتے جلتے ختم ہونے پر ہے۔ باہر چاروں طرف گھُپ اندھیرا ہے —— مُوسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ بہت سے جھینگر بلند اور کرخت آواز میں لگاتار چلا رہے ہیں۔ کبھی کبھی گیدڑ کے بولنے اور ساتھ ہی کُتّے کے بھونکنے کی آواز سُنائی دیتی ہے۔ کہیں دُور بجلی گری۔

"یہ تو واقعی بُری بات ہوئی"

مُراد نے اُٹھ کر اٹیچی کیس سے ایک نئی موم بتّی نکال کے جلائی۔ سگرٹ سُلگا کے کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ کسان جس طرح بگڑے

ہوئے ہیں اگر مجھے مار بھی ڈالیں تو عجب نہیں۔ تصویر کھینچنا ان کی نظر میں ویسے ہی پاپ ہے اس پر ایک نوجوان لڑکی کو ماڈل بنا کر تصویر کھینچنا! کئی چھوکرے تو ابھی ابھی دھمکی دے گئے ہیں۔ دو ایک بوڑھے بزرگ بھی آئے تھے۔ چھوکروں کا غصہ ہی شاید تیز ہے۔ ہوتا ہی ہے۔

مُراد نے ختم شدہ سگرٹ کا آخری کش لے کر اسے پھینک دیا اور دوسرا سگرٹ سُلگا کر بچھونے پر آ بیٹھا۔

—— "پیرس میں بیشک ایسی ایسی باتیں عام ہیں، مگر ہمارے ملک میں تو بڑے بڑے شہروں میں بھی جو لڑکیاں یا عورتیں ماڈل بن کے روپیہ کماتی ہیں وہ ہرگز شریف گھرانے کی نہیں سمجھی جاتیں۔ تو پھر میں نے کیوں ایسا احمقانہ کام کیا لیکن قصور تو دراصل لڑکی کا ہے۔ اس نے خود ہی تو مجھ سے اپنی تصویر کھینچنے کو کہا اور پھر خود ہی شکایت کر دی۔ یہ لونڈیا بہت پاجی نکلی۔ البتہ اسے اس بات کا سان گُمان بھی نہ ہوگا کہ میں اسے ایک جانگیا دُوں گا اور کہوں گا کہ یہ پہن لو اور ساری اتار دو۔ —— اور کونے میں جا کے چُپ چاپ کھڑی ہو جاؤ —— میں تمہاری تصویر کھینچ دیتا ہُوں۔"

متحیر اور خوف زدہ گُلتانی کے چہرے کا نقشہ مراد کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا —— اس کے خوف زدہ بھاگنے کا انداز۔

"لیکن بخدا کیا ہی انوکھی جوانی ہے، اس کے سارے بدن میں جھلکتی ہے! بات چیت میں بھی ذرہ برابر جھجک نہیں ــــ تعجب ہے"!

اچانک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور ــــ دبی آواز میں کہا: "دروازہ کھولئے" مراد چونک پڑا۔ ڈرتے ڈرتے پوچھا: "کون؟"

ــــ "گلتانی!"

مراد کے دروازہ کھولتے ہی گلتانی گھر کے اندر آگئی۔ احتیاط سے دروازہ بند کر دیا اور کہا: "جلد چلئے میرے ساتھ ــــ کپڑا لتا جو اور جیسا بھی ہے جلدی جلدی سمیٹ لیجئے" "مگر کیوں!" مراد نے پوچھا۔

"سارے گاؤں کے لوگ آپ سے بگڑ گئے ہیں۔ کل وہ آپ کو مار ڈالیں گے"!

مارے خوف کے مراد کا سارا جسم سن پڑ گیا مگر اس نے کہا "میں پروا نہیں کرتا"

"کیا مطلب"

ــــ میں مرنے سے ڈرتا نہیں!

ــــ مرنے سے نہیں ڈرتے، مار سے تو ڈرنا چاہیئے۔

ــــ گلتانی ہنسنے کو تھی، مگر رک گئی۔

مراد نے کہا: میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ خدا جانے اور کس مصیبت میں ڈال دو گی۔ تم ہی نے تو شکایت کر کے یہ فتنہ برپا کیا ہے۔

گلتانی نے کہا: میں نے تو کچھ نہیں کہا ــــ آم کے پیڑ پر چھپ کے

دو آدمیوں نے ہمیں دیکھا۔ انھوں نے جا کے سب سے کہہ دیا۔ اور بھی بہت سے جھوٹے الزام لگائے۔ خدا جانے کیا کیا کہا۔ یہ دیکھئے ماں نے مجھے کتنا مارا ہے۔“

گلتانی نے مراد کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا ”چلئے جلدی کیجئے۔ ناؤ گھاٹ پر لگی ہوئی ہے۔ کسی نے بھانپ لیا تو پھر بچنا مشکل ہے۔“

بارش میں گلتانی بالکل بھیگ گئی ہے۔ بھیگی ہوئی ساری اس کے بدن سے چمٹ گئی ہے، بُری طرح لپٹی ہوئی ہے۔ گلتانی کو اس عالم میں دیکھ کر مراد کا دل بے اختیار ہو گیا۔

مراد نے کہا: ”تم چلو گی میرے ساتھ، گلتانی!“

—”کہاں“؟

—”کلکتے۔ میرے گھر۔“

—”مجھے لے جا کے آپ کیا کریں گے؟ جانگیا پہنا کے تصویر کھینچیں گے؟“

گلتانی دبی آواز میں کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

—”شادی کروں گا میں تجھ سے۔“

—”آپ نے اب تک شادی نہیں کی؟“

—”نہیں۔ ایسا انوکھا حسن لے کے اس ذلیل گاؤں میں پڑی سڑتی رہو گی؟ یہاں کوئی تمہاری پوری قدر نہیں کرے گا۔ سمجھے گا بھی نہیں

تمہاری اصلی قدر و قیمت۔"

گلستانی مراد کی طرف نظر جمائے چند لمحے دیکھتی رہی پھر بولی: "چلئے۔ ناؤ میں گنجر اکیلا ہے۔"

"گنجر کون؟"

گلستانی مسکرائی: "ناؤ میں آئیے۔ دیکھ لیجئے۔ ہم بھی بھاگ رہے ہیں۔ میں اور گنجر۔"

"شہر کے کارخانے میں اسے نوکری مل گئی ہے۔ ہم دونوں وہیں گھر بنا کے رہیں گے۔" مراد احمقوں کی طرح دیکھتا رہ گیا۔

دُور ایک اور بجلی گری ❖

ابوالکلام شمس الدین

ترجمہ: ابوسعید نورالدین

سیلاب

سیلاب کا پانی آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ساون کی موسمی ہوا گویا اچانک تند و تیز ہو کر اسے بحیرۂ بنگال سے کھینچ تان کر لا رہی تھی اور اس کے ساتھ آسمان پر چھا جانے والے سفید بادلوں کو بھی پچھلے پہر کی پھوار کی طرح بارش کی جھڑیاں باندھتی اور دن رات پیچ و تاب کھاتی یہ ہوا بہت زور سے چلتی ہے۔ درخت کبیدہ خاطر ہو کر اس سے اپنا دامن بچانا اور چپ رہنا چاہتے ہیں، وہ اپنی نازک ٹہنیاں ہلا ہلا کر یہی کہتے ہیں:۔ "بارش کو آنے دو، ہم جی بھر کر نہائیں گے، بچوں کی طرح خوش ہو ہو کر ناچیں گے لیکن ابھی بارش کے بغیر تمہارے ساتھ دوستی کرنے میں کوئی فائدہ نہیں، ہم سن رسیدہ ہو چکے ہیں۔ جیت کے مہینے سے تمہارے ساتھ

مسلسل کشمکش کے باعث ہمارے اعضاء دُکھنے لگے ہیں اور پھر اب ہمیں تمہاری اتنی ضرورت بھی تو نہیں۔"

نیچے جھیل کے علاقے میں دھان کے کھیت اس وقت پانی سے بھرپور ہیں۔ راستے گھاٹ، سب ڈوب گیا ہے۔ حتیٰ کہ اِدھر اُدھر بہتی ہوئی نالیوں پر بانس کی پالیں بھی ڈوبنے لگی ہیں۔ دھان کی نازک ٹہنیاں اب تک اپنی ناک کو بچاتی ہوئی پانی کو پرے ہٹانے کے لئے لڑ رہی تھیں، پانی کو اور تیز ہوتا دیکھ کر ڈر لگتا ہے کہ کہیں پانی کو ہٹتے ہٹتے ساون کا پورا مہینہ ہی نہ لگ جائے۔ اس وقت صرف خدا ہی کی ذات ہے جو طوفان اور اس کی تباہکاریوں کو دُور کر سکتی ہے۔ چنانچہ آسمان کی طرف مُنہ اُٹھا کر رحمت کی التجا کرنے کے لئے گھر گھر میلاد کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔ جب اس تند و تیز ہوا سے گھروں کی دیواریں اور چھتیں تک کانپ کانپ اُٹھتی ہیں تو کسان لوگ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر زور زور سے اللہ اللہ کرتے ہیں اور یُوں محسوس کرتے ہیں گویا پانی ہٹ گیا ہے۔ ہوا خاموش ہو کر بادل کے ٹکڑوں کو کہیں اُڑا لے گئی ہے، ہر کھیت میں دھان کی لاکھوں کروڑوں نازک ٹہنیاں خدا کی جناب میں جُھک جُھک کر سجدۂ شکر ادا کر رہی ہیں۔

باڑیال[2] کے کنارے پر ٹھہر کر کولا[1] کے دل خوش کُن پانی کا نظارہ

---

[1] اونچی جگہ جس کے چاروں طرف برسات کے زمانے میں سیلاب کا پانی آتا ہے، اس میں لوگ بستے ہیں۔
[2] باڑیال کے چاروں طرف نشیبی حصہ جس میں دھان کے کھیت ہوتے ہیں۔

کرنا اور اس تند و تیز ہوا کو محسوس کرنا مدّو کو بہت پسند تھا۔ پانی کی لہریں بڑی بڑی موجیں بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے رقص کرتی تھیں۔ چاروں طرف پانی سے گھرا ہوا باڑیال ایک چھوٹی کشتی کی طرح معلوم ہوتا تھا جو موجوں کے تھپیڑوں سے آگے بڑھنے کی ہزار کوشش کے باوجود پیچھے ہٹتی جا رہی ہوں گویا ملّاح ان موجوں سے لڑ کر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ دیکھ کر مدّو خیال کرتا کہ اس کے کامیاب ہونے کا امکان بھی کیا ہے۔ جہاں تک اس کے اپنے خاندان کا تعلق ہے اس کا ناخدا تو اس کا باپ ہے جس کو ہٹ دھرمی کے سبب کوئی سوجھ بوجھ نہیں۔ چاروں طرف مصیبت کا ایک بے پایاں سمندر ہے، اس کا باپ اس کی تمناؤں کو فضول سمجھ کر انہیں ملیامیٹ کرنے پر آمادہ ہے۔ مدّو نے سوچا جب اس کے ماں باپ ہی کو اس کی خوشی منظور نہیں تو وہ کیوں ان کی آسائش کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کرے۔

باڑیال کے انتہائی کنارے پر کھڑا مدّو چٹان کے سرے پر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ موجیں بہت دور سے پیچ و تاب کھاتی ہوئی چٹان سے ٹکرا رہی تھیں۔ چٹان کے نیچے پانی کی سطح پر بہت سے سرخی مائل بلبلے اکٹھے ہو گئے تھے۔ چٹان کی مٹی میں سانکٹ[1] کے انڈے پڑے تھے۔

---

[1] پانی میں ایک سخت جسم کا جانور جس کے انڈے سفید ہوتے ہیں، یہ خشکی پر بھی رہتا ہے۔

مدّو نے کچھ انڈوں کو پاؤں سے توڑ کر نیچے گرا دیا اور وہ ان بلبلوں میں گم ہو کر اچھلتے اچھلتے خبر نہیں کہاں غائب ہو گئے۔

کچھ دنوں سے مدّو بھی اپنے دل میں ایک پُرزور جذبہ محسوس کر رہا تھا ——— اس سیلاب ہی کی طرح تند و تیز بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اس کا کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ رات کو سونے سے قبل وہ سوچ بچار کرتا تو اسے اپنے معاملہ کا فیصلہ آسان نظر آتا لیکن وہ کرتا بھی تو کیا۔ جب وہ اُمڈے ہوئے پانی کے کنارے بیٹھا تھا تو اس کا جذبۂ دل ساری پابندیوں کو توڑ کر باہر نکل آیا اور اس نے ایک ہیجان پیدا کر دیا۔ اس پریشانی کے عالم میں مدّو نے اوپر کی طرف نظر اُٹھائی، سر پر ایک شاخ لٹک رہی تھی ——— ڈوّا[1] کی شاخ۔ پتّوں کے نیچے ڈوّے گویا ہوا سے آنکھیں چُرا رہے تھے۔ کوئی سبز، کوئی سُرخی مائل۔ ایک جگہ اسے کچھ پکّے ڈوّے نظر آئے، اسے خیال آیا کہ اس نے مدّتوں سے ڈوّا نہیں کھایا بچپن میں تو کتنے ہی کھایا کرتا تھا۔ ڈوّا، بیت پھل اور جامن کا تو وہ اب بھی شیدائی تھا۔ کمر میں مضبوطی سے پٹکا باندھ کر وہ بڑے اشتیاق سے درخت پر چڑھ گیا۔ ڈوّا کے پتّوں پر سفید رونگٹے ہوتے ہیں جو بدن میں چُبھ جائیں تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ مدّو نے

---

[1] ایک کھٹا پھل؛

ان کی کوئی پروا نہ کی اور ڈوّوں کو توڑنے کے لئے اوپر چڑھتا گیا۔ کچھ فاصلے پر ایک شاخ کے بالائی حصے پر پانچویں پکّے ڈوّے کو توڑتے ہوئے مدّو پاؤں پھسل جانے سے گرتے گرتے بچ گیا۔

دفعتاً نیچے کوئی کھِلکھِلا کر ہنس پڑا۔ یہ اس کی چھوٹی بہن ہاجرہ تھی جس کو سب ہاجی کہہ کر پکارتے تھے۔ مدّو دانتوں سے ہونٹ چباتے ہوئے جسم کو بار بار گھماتا، پاؤں سے ایک شاخ کو پکڑنے کی بے انتہا کوشش کر رہا تھا۔ اس کی حرکات دیکھ کر ہاجی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئی "چپ!" مدّو نے چلّا کر کہا، ہاجی نے ہنستے ہنستے کہا "تم تو گائے کے لئے گھاس کاٹنے گئے تھے بھیّا"۔ مدّو شاخ کو پاؤں سے نہ پکڑ سکا اور ہانپتے ہانپتے کولاّ کے پانی میں کُود پڑا۔ پھر باہر نکل کر زور سے ہاجی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "کیوں، اس طرح کیوں ہنس رہی ہے"! ہاجی نے اس کی بالکل پروا نہ کی اور اس کی ڈب پر ہاتھ ڈال کر کہا "مجھے بھی دو نہ ایک بھیّا"

لیکن مدّو نے اس کو زور سے طمانچہ مار کر کہا "نیچے کھڑی ہنستی ہے، اگر میں نیچے گر جاتا اور ہاتھ پاؤں ٹوٹ جاتے تو" ہاجی کے ہاتھ سے ڈوّا تو گر ہی گیا تھا وہ خود بھی چکّر کھا کر گرتی گرتی بچی، نو سالہ لڑکی کا نازک چہرہ باسی پھول کی طرح مرجھا گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

تھوڑی دیر بعد مدّو کی طرف ایک طنز آمیز نگاہ ڈال کر وہ نیچے کی طرف کھیل میں مصروف ہنس کے بچّوں کو اُٹھا کر دوڑتی ہوئی گھر واپس چلی گئی۔

"بابا جان سے کہا تو جان سے مار ڈالوں گا"۔ مدّو نے پیچھے کی طرف سے دانت پیستے ہوئے کہا۔ اس کے بعد زمین پر گرے ہوئے ڈوّے کو اٹھا کر ڈبّ میں رکھ لیا اور چبوترے پر جا بیٹھا۔ کہیں سے کتنے ہی ہنس تیرتے ہوئے آرہے تھے۔ مدّو نے پاگلوں کی طرح ٹوٹے ہوئے سانک کے ٹکڑے اور مٹّی کے ڈھیلے مار مار کر انہیں بھگا دیا، اس کے بعد ڈوّے نکال کر زمین پر رکھ دیئے اور بھیگے کپڑوں کو نچوڑ کر سارا بدن پونچھا۔ پکّے ہوئے ڈوّوں کا رنگ کیا کہنا، ان کا رونگٹوں والا چھلکا کاٹ کر نمک مرچ کے ساتھ کھانے میں بڑا مزہ آتا ہے لیکن مدّو نے سوچا نمک مرچ کہاں سے آئے گا؟ باجی کو ناخوش کرنا اچھا نہیں۔ اس کے جی میں آئی کہ تمام ڈوّے پانی میں پھینک دے لیکن پھینکتے پھینکتے خبر نہیں کیا سوچ کر انہیں نہ پھینکا۔ اس نے دو ڈوّے پاس ہی ایک کھجور کے درخت کے نیچے دبا دیئے اور باقی دو کو ہاتھ میں لے کر بڑی احتیاط سے مکان کے پیچھے کی خندق کو عبور کر کے باورچی خانہ کے پاس جا پہنچا۔ گھر کا رُخ شمال کی جانب تھا اور باورچی خانہ پیچھے کی طرف، دیوار کے قریب گھر سے الگ

اور احاطہ بنا ہوا تھا۔ مدو وہیں جاکر ٹھہرا جہاں ٹوٹی ہوئی ہنڈیوں کے ٹکڑے، ترکاری کے چھلکے، بھات کی کھرچن اور دوسری گندی چیزیں پھینکی جاتی تھیں۔ اس کے باپ نے صبح کے وقت کہا تھا کہ شمالی مکان کے باغ سے گائے کے لئے گھاس کاٹ کر لے آنا لیکن وہ غصہ کے مارے وہاں نہیں گیا۔ اس نے نظر اٹھا کر ذرا پرے دیکھا تو باجی ہنس کے بچوں کو سانک کھلا رہی تھی۔ مدو کی آواز سن کر اس نے مڑکر دیکھا لیکن پھر بھی اس کی طرف پیٹھ موڑ کر ہنس کے بچوں کو سانک کھلانے میں مصروف ہوگئی۔ مدو نے آہستہ سے اس کو پھر بلایا۔ "یہ لے تیرے لئے لایا ہوں"۔ پھر بھی باجی نہ اُٹھی اور نہ اس نے مُڑکر دیکھا۔ مدو نہایت عاجزی سے کہنے لگا "پیاری بہن ذرا سُن تو"۔ وہ بولی "تم نے مارا کیوں تھا"۔ مدو نے کہا "آئندہ جو کبھی ہاتھ اٹھاؤں! یہ لے میں نے توبہ کی"۔ باجی اب مڑکر کِھل کِھل ہنس دی۔ مدو نے کہا "اِدھر آ"۔ باجی آگے بڑھی، اور پوچھا "کیا؟"

"تو نے مانگا تھا نا، لے اسے جلدی جلدی تیار کرلے"۔ عین اسی وقت صحن کی طرف مدو کے باپ کے کھنکارنے کی آواز سنائی دی۔ "کدھر گیا ہے وہ......؟" مدو کا ہاتھ لرز گیا۔ دونوں ڈوڈے زمین پر گر پڑے۔ خندق کو عبور کرکے وہ چشم زدن میں پھر ڈوڈے کے درخت کے نیچے

اُکھڑا ہوا۔ اس طرف اس کے باپ کے آنے کا اندیشہ نہ تھا پھر بھی اس نے دونوں ٹوکرے ڈب میں دبا لیے اور قریب ہی بندھی ہوئی ایک کشتی پر سوار ہو کر دوسرے باڑیال میں جا اُترا جہاں سے ایک مکان کے پیچھے تالاب کا گھاٹ نظر آتا تھا۔ اس طرف نظر پڑتے ہی مدّو کے دل میں پھر وہی ہیجان پیدا ہو گیا۔ گھاٹ پر "وہ" آنچل تر کر کے بدن پر مل رہی تھی۔ باپ کے ساتھ ایک دفعہ راجہ کی کچہری میں لگان دینے جا رہا تھا کہ تالاب کے سیاہ پانی پر پدما پھول دیکھا تھا اور دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہو گیا تھا اور اس کو پانے کے لئے رو رو کر ہلکان ہو گیا تھا۔ وہی دن، وہی لمحہ اور وہی محبوب یاد آج پھر تازہ شکل میں اس کی آنکھوں کے سامنے اُبھر آئی۔ راجہ کے تالاب پر پدما اس کی قسمت میں نہ تھا لیکن یہ لڑکی! بچپن کی بے بسی اور محرومی کیا بیس سال کی عمر میں بھی برقرار رہے گی۔ جب اس کا سینہ اس قدر فراخ ہو گیا تھا؟ اِدھر اُدھر دیکھ کر لڑکی کی نظر بچاتا ہوا وہ آہستہ آہستہ گھاٹ کے پاس پہنچا اور یکایک بول اٹھا "ہیم!"

ہیم چونک اُٹھی، گویا اُسے بجلی کا تار چھو گیا ہو اور وہ اِدھر اُدھر خوف آمیز نگاہیں ڈالتی ہوئی جھٹ گلے تک پانی میں اُتر گئی۔ اس کی زبان سے صرف ایک دھیمی سی آواز نکلی۔ "اوہ!" مدّو سمجھ گیا کہ اس کا وہاں آنا ہیم کو ناگوار گزرا ہے۔ پھر بھی اس نے مسکرا کر کہا "تمہیں شرم

آتی ہے ہیم!" ہیم نے کوئی جواب نہ دیا اور نیچے پانی کی طرف نظر جمائے رکھی۔

"تمہیں تنہا پانا مشکل ہے، چلے جانے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ یہ دیکھو دو ڈوّے لایا ہوں"۔ مدّو نے دونوں ڈوّے نکال کر اسے دکھائے۔ کتنے عرصہ سے نہیں کھائے۔ چاہتا تھا کہ گھر جا کر کھاؤں لیکن باواجان غصہ تھے، انہوں نے ایسا کوسنا شروع کیا کہ لا پار کر کے تمہارے پاس آگیا، بتاؤ گی؟ تم کو بھی تو اچھے لگتے ہیں"۔

ہیم ڈرتی کانپتی اِدھر اُدھر دیکھتی رہی اور بولی "یہ کیا بدتمیزی ہے، اس طرح پچھلے دروازے کے پاس چکر لگاتے ہو"۔

"آنے پر مجبور ہوں۔ ہیم! کیا تمہیں معلوم نہیں؟"

"اب سب کچھ بیکار ہے۔ میں اب کسی اور کی ہوں۔ منشی کے گھرانے میں باواجان نے بات طے کر لی ہے"۔

"بات طے کر لی ہے!"

"طے نہ کرتا؟ تھوڑا کر کے کتنی مدت گزر گئی۔ تمہارے باپ نے کیوں بات نہ کی۔ اب تم جاؤ"۔

مدّو نے نہ جانے کیا سوچ کر یا ہیم کی باتوں سے ناراض ہو کر جھنجھلاتا ہوا جس راستے سے آیا تھا اس سے واپس جانے لگا۔ لیکن چند قدم چل کر وہ آگے نہ بڑھ سکا، اس نے مڑ کر دیکھا۔ ہیم بدن پر کپڑے لپیٹتی ہوئی کنارے پر آگئی تھی۔ شیشے کی چوڑی سے مزین وہ خوبصورت ہاتھ بالکل

کیلے کے جھاڑ کی بیڑ[۱] کی طرح ! وہ گھر کی طرف جلدی جلدی قدم اٹھا کر بڑھتی جا رہی تھی۔ مدّو کے ہر قطرۂ خوں میں سخت جوش پیدا ہو گیا۔ اس نے سوچا یہ لڑکی بھی میری قسمت میں نہیں۔ اس نے جلدی سے چند قدم آگے بڑھائے، اور نہایت عاجزی سے آواز دے کر کہا "پیالی میں کچھ نمک مرچ ڈال کر چبوترے کے پاس آنا ہیم! میں انتظار کروں گا۔" ہیم نے مُنہ موڑ کر تیز نگاہ سے اسے دیکھا اور حویلی کے اندر گھس گئی۔ مدّو واپس آ کر پھر چبوترے پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ زیادہ دُور نہیں ہو گز کے فاصلے پر ان لوگوں کا باڑیال تھا جہاں وہ بیٹھا تھا، وہاں کسی کی نگاہ پڑنے کا اندیشہ نہ تھا۔ دونوں ڈوبے نکال کر اس نے پاس رکھ لئے۔ سیلاب کی موجیں چٹان کے ساتھ ٹکرا رہی تھیں۔ تند و تیز ہوا نے کیلے کے درخت کے پتوں کو چیر پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ لال رنگ کے پھُول سب ہلتے ہلتے پریشان ہو گئے تھے۔ سفید بادل کے ٹکڑے نیلے آسمان کو ڈھانپ کر اِدھر اُدھر اُڑتے جا رہے تھے۔ دُور، چوڑی کھال کا پل ڈوبنے ہی والا تھا۔ مدّو کبھی اس پُل کی طرف دیکھتا، کبھی چبوترے کے نیچے پانی کی سطح پر بلبلوں کا نظارہ کرتا اور اس طرح ہیم کے آنے کی گھڑیاں گنتا ہوا پریشان ہو گیا۔ آسمان پر بادلوں کی کثرت سے اندھیرا چھا گیا، کچھ دیر بارش رہی اور اس کے تھم جانے پر

---

[۱] کیلے کے درخت کا اندرونی سفید گول حصہ۔

بھی ہیتیم نہ آئی۔ بیٹھے بیٹھے جب اس کا جی اُکتا گیا تو یکایک اس کے کانوں میں کشتی کی آواز سنائی دی۔ باغ کے اس طرف کھال کے کنارے کوئی کشتی باندھ رہا تھا۔ مدّو کو اس میں دلچسپی پیدا ہوئی اور اس نے کھڑے ہو کر دیکھنے کی کوشش کی۔

اس کا اندازہ صحیح نکلا۔ اس کا ایک ہم عمر نوجوان کشتی باندھ کر ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس نے دونوں ہونٹوں کو سکیڑ کر تین دفعہ سیٹی بجائی۔ کیوں؟ اس کا اندازہ لگانا مدّو کے لئے ممکن نہ تھا۔ جنگل اور جھونپڑیوں کے پیچھے چھُپ کر وہ دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ دوسری دفعہ سیٹی بجانے پر اس نوجوان کا چہرہ نظر آیا۔ مدّو نے اس کی نگاہ کی سیدھ میں دیکھا۔ اُدھر حویلی کے قریب ہیتیم کھڑی تھی اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا، نوجوان کی آواز پر وہ اِدھر اُدھر بڑی احتیاط سے جھانکنے لگی، نوجوان نے بھی مُڑ کر دیکھا۔

مدّو نے جھونپڑی کے پیچھے بیٹھ کر ایک لمحہ سوچا کہ کیا کرنا چاہیئے، نوجوان کو وہ پہچانتا تھا، وہ فوجی گھرانے کا بڑا لڑکا منصور تھا۔ اس نے دل میں کہا اس پر حملہ کر کے اسے اچھا سبق دیا جا سکتا ہے لیکن وہ بڑے اونچے لوگ ہیں، اس لئے خواہ مخواہ جھگڑا چھیڑنے سے فائدہ۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس کو پکڑ کر رسوا کریں۔ اتنے عرصہ بعد اسے یہ پتہ چلا

کہ ہیم بھی دوسری عورتوں کی طرح بے وفا ہے لیکن اس کی بے اعتنائی کو برداشت کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ اس نے پھر سر اٹھا کر دیکھا۔ ہیم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گھر کی طرف جارہی تھی اور منصور نے بھی کشتی پر چڑھ کر لگی[1] ہاتھ میں لے لی تھی۔ ندو نے ایسا محسوس کیا کہ اس موقع پر وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوگئے اور ـــــ اس کے دل میں شعلے بھڑک اٹھے۔

ہیم کے لئے اس نے کیا کچھ نہ کیا تھا۔ آلشا مچھلی پکڑنے گیا تو باپ سے چھپا کر سب سے بڑی اس کو دے دی۔ آموں کے موسم میں سب سے زیادہ سرخ آم اس کو پہنچائے۔ جاڑے کے دنوں میں جھیل جاکر ملگجی، موٹی جنگری[2] اور کائی[3] مچھلی پکڑی اور اپنی ماں کی بجائے اس کو دے آیا۔ سپاری بیچ کر، کھند[4] کا دھان بیچ کر، کچہری کے بازار سے کبھی کچھ کبھی کچھ لا کر دیا۔ ایک دفعہ پوتھ کی مالا خریدنے کے لئے دھان کے روپے کے حساب میں گڑبڑ کردی اور باپ نے پکڑ لیا۔ عصمت اللہ نے اس دن سر بازار بے عزتی کی، اور تو اور اپنی چھوٹی بہن کو بھی محروم کر کے گئے سال ہیم کو کتنے ہی تحفے دیئے۔

---

[1] کشتی چلانے کا بانس، جس کی لمبائی چھ سات ہاتھ ہوتی ہے۔

[2] جھینگا۔ [3] ایک مچھلی جس کی پشت پر کانٹے ہوتے ہیں۔

[4] دھان کاٹنے کے لئے سال میں دو تین موسم ہوتے ہیں۔ ہر موسم کو بنگالی میں کھند کہتے ہیں۔

آج بھی چھوٹی بہن کو مار پیٹ کر دو بہترین ڈوّے اسی کے لئے لے کر گیا تھا۔

اپنی قربانیوں کے لمحے یاد کر کے مدّو کی محبت شدید نفرت میں تبدیل ہو گئی۔ تو کیا ہیم نے اتنی مدّت اس کے ساتھ مذاق ہی کیا؟ وہ بھی پیسے والے ہی کی طرف مائل ہو گئی۔ اس میں منصور کا کیا قصور ہے۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب جال ہیم ہی نے پھیلایا ہے، پھر مدّو کو ہیم کا خوش خوش چہرہ یاد آیا۔ وہ غصّہ کے مارے دانت پیس کر یکایک اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہیم کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس نے حقیقی سانپ کی دُم پر قدم رکھا ہے۔ وحشیانہ طور پر ہیم کے گھر کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے دونوں ڈوّے زمین پر پٹک دیئے اور اپنے پاؤں سے رگید کر چبوترے کو طے کرتا ہوا کولا کے پانی میں اُتر گیا۔

کشتی میں گھاس بھر کر جب وہ گھر لوٹا تو سورج بالکل ڈھل چکا تھا، خوش قسمتی سے باپ اس وقت گھر پر نہ تھا۔ دونوں گائیوں کو گھاس دینے کے بعد وہ نہا دھو کر صحن میں داخل ہوا۔ اس کی ماں نے اس وقت تک اس کا راستہ دیکھتے دیکھتے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس کے تیور دیکھ کر مدّو نے کہا ضرور کوئی بات ہے۔ ماں نے پوچھا "تم باوا جان سے تو نہیں ملے؟"

"نہیں۔ کیوں؟"

ماں نے کہا "ہیم کے باپ نے شکایت کی ہے کہ مدّو کے سبب اس کے گھر کی آبرو خطرے میں پڑ گئی ہے وہ نہانے کے گھاٹ کی طرف

جھانکتا رہتا ہے۔ تمہارا باپ یہ سُن کر آگ بگولا ہو گیا، ابھی ابھی وہ کشتی لے کر کہیں باہر نکل گیا۔" ماں کی زبانی یہ باتیں سُن کر مدّو بہت شرمندہ ہوا۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا " وہ تو صرف ہیم کو دو ڈوّے دینے گیا تھا، اُسے کیا معلوم تھا کہ ——"

ماں نے ہنس کر کہا " میں سمجھ گئی، لیکن اس سے فائدہ ہی کیا، وہ تو بہت چھوٹے آدمی ہیں۔ ہمیشہ تیرے باپ دادا کے ساتھ دشمنی کرتے آئے ہیں۔" مدّو نے دل میں کہا میں اس دشمنی ہی کا تو خاتمہ کرنا چاہتا تھا۔" کھانا کھا کر مدّو گھاٹ پر لیٹ گیا۔ وہ ایک پوری سُپاری منہ میں دبا کر چبانے لگا۔

ہاجی، خبر نہیں کہاں ہنس کے بچّوں سے کھیل رہی تھی، وہ دوڑتی ہوئی آئی اور اس پر کود کر بولی " بھیا! میں ڈوّے بنا کر کب سے راستہ دیکھ رہی ہوں۔ تمہارے لئے لاؤں؟" مدّو چونک اٹھا۔ ڈوّے کی یاد دلا کر اس نے اس کے دل پر ایک اور نشتر لگا دیا۔ اس نے اسے پرے دھکیل کر دھمکی دیتے ہوئے کہا " جا مجھے نہ ستا، تو کھالے " ہاجی نے شوخی سے کہا " بھیا تم نے اتنی تکلیف اٹھائی "۔ مدّو غصہ میں آگیا، اس نے پھر مڑ کر طمانچہ مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا لیکن وہ کھِل کھِل کرتی بھاگ گئی۔ مدّو لیٹ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس چھوٹے منہ سے اتنی بڑی بات۔ واقعی اس نے کس قدر تکلیف اٹھائی تھی، ماں باپ نے اس کو نہ سمجھا۔ اس نے ایک

اجنبی لڑکی کو دل دیا۔ اس نے بھی دھوکا دیا۔ تکلیف اٹھا کر بھی وہ اس چیز کو نہ پا سکا جس کو وہ پسند کرتا تھا۔ یک لخت اُٹھ کر وہ پھر ڈوبے کے درخت کے پاس جا پہنچا۔

دن آخر ہوتے ہوتے اچانک دھوپ نکل آئی تھی۔ ابر کے پیچھے سے دھوپ کولا کے پانی میں اِدھر اُدھر پڑ کر موجوں پر رقص کرنے لگی۔ مدو نے چبوترے پر بیٹھ کر آم کے درخت سے تکیہ لگایا اور نیچے نگاہ ڈال کر دیکھا۔ صبح جہاں اس نے سانپ کے انڈے لات مار کر توڑ دیئے تھے پانی وہاں تک بڑھ آیا تھا۔ کولا میں دھان کے پودوں کے سر کہیں دکھنے میں آتے تھے، کہیں نہیں آتے تھے۔ متلاطم پانی کی موجوں اور ہوا کے تھپیڑوں سے ان پودوں کی جان بچانے کی آخری کوشش بھی ناکام ہوتی جا رہی تھی یکایک مدو سامنے کے وسیع کولا کے اردگرد بڑی شدت سے نظر دوڑانے لگا۔ گویا وہ اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ پانی کہاں زیادہ گہرا ہے۔ اسی حالت میں بیٹھے بیٹھے شام ہوگئی۔ کولا کے چاروں طرف گاؤں کے درختوں کی لمبی قطار ڈوب گئی۔

اندھیرے میں بیٹھ کر مدو تُند ہوا کا شور سننے لگا۔ کنارے پر کی جھونپڑیوں میں کیڑے مکوڑے اور مینڈک سب ایک ہی لے میں آوازیں بلند کئے جا رہے تھے۔ ایسی راتوں میں کولا مدو کو بچپن ہی سے بڑا پُراسرار معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت تو پانی میں طرح طرح کی چیزیں چلتی پھرتی دکھائی دیتی تھیں لیکن پوس ماگھ کے اواخر میں جب زمین بالکل خشک ہو کر

چٹیل میدان بن جائے گی تو کچھ بھی دکھائی نہ دے گا۔ کم سن لڑکے اس وقت کچے باناٹی[1] کو گیند بنا بنا کر کھیلیں گے اور ہر طرف ایک دھوم مچ جائے گی لیکن مدو کے دل کو جو بے چینی لاحق ہوئی تھی اس میں یہ سب خیالات بڑی دیر تک قائم نہ رہ سکے مگر جب تک اس کا باپ سو نہ جائے اس کا گھر واپس جانا ناممکن تھا اور اسی طرح اکیلے بیٹھے رہنا بھی مشکل تھا۔ یکایک، خبر نہیں کیا سوچ کر، اس نے کچھ دُور بندھی ہوئی چھوٹی کشتی پر اتر کر لگی[2] ہاتھ میں لے لی۔

چھوٹی کشتی موجوں کے سر پر ڈولتی ہوئی جا رہی تھی! اور موجوں کے اُچھل اُچھل کر کشتی کے پہلوؤں پر گرنے کی آوازیں مدو کو بہت خوشگوار معلوم ہوتی تھیں۔ کروڑوں چھوٹی چھوٹی موجیں چاروں طرف سے دوڑتی ہوئی آ کر اس کے بدن پر گویا لاکھوں ہاتھوں سے جلترنگ بجاتی تھیں، کوئی "بابایاں[3] بوں" اور کوئی چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے دف بجانا چاہتی تھیں اور کشتی ہلتی جُلتی گرتی پڑتی کسی مغرور دوشیزہ کی طرح آگے بڑھتی چلی جاتی تھی۔ تُند ہوا سے جب بڑی بڑی موجیں پیچ و تاب کھاتی ہوئی آتی تھیں تو کشتی اُلٹ پلٹ جاتی تھی۔ اس وقت مدو "لگی" کو پانی میں گہرا ڈبو کر کشتی کے سر پر کھڑا ہو جاتا تھا۔ موجیں کٹ کٹ کر، دو نیم ہو ہو کر

---

[1] گیند جیسا بڑا پھل جس کا بدن نرم ہوتا ہے۔ [3] ایک باجا۔

پھولوں کی پنکھڑیوں کی طرح خوبصورت اور نرم ہو ہو کر دونوں طرف بکھرتی ہوئی راستہ صاف کر دیتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کشتی خوش آہنگ سیال جواہر کی رووں کے اوپر سبک ہو کر بہتی چلی جا رہی ہے۔ دس بارہ سال کی عمر میں تو مدّو یہ خیال کرتا تھا کہ شاید وہی "روپ کتھا" کا شہزادہ تھا لیکن آج اسے ایسا کوئی خیال نہ آیا۔ وہ سیلاب کے متعلق سوچ رہا تھا کہ اس میں اتنی تندی و تیزی کہاں سے آتی ہے۔ کیا اس کی یہ بھوک کہ وہ ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر بہا لے جائے کبھی نہیں مٹے گی؟ اس سیلاب سے بھی بڑھ کر جو تیز ناقابلِ ضبط بھوک آج بھیگے کپڑوں میں ملبوس، ڈوّا کی طرح رنگین ہیم کو دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوئی تھی کیا یہ بھوک کبھی نہیں مٹے گی؟ اس کو اپنے بازوؤں سے بیکر گھائل کرنے کا جذبہ اسی سیلاب ہی کی طرح ہے؟ کیا وہ ماں باپ کی بے اعتنائی اور ہیم کی غداری کو یونہی بے چون و چرا تسلیم کر لے گا؟ کبھی نہیں! اگر ہیم اس کی نہ ہوئی تو کسی کی بھی نہیں ہو گی۔ ان خیالات میں ڈوب کر اس نے لگی چلانا بند کر دیا تھا، اس نے جی کڑا کر کے کشتی موڑی اور ہیم کے مکان کی طرف دیکھا، ہوا اتنی تیز تھی کہ وہ جلد ہی اس کے پاس پہنچ گیا۔ بڑی مضبوطی سے لگی پکڑ کر مدّو دلجمعی کے ساتھ گنجان، سایہ دار درختوں کی قطار پر نظر دوڑاتا ہوا

کشتی پر کھڑا رہا۔ نہ جانے کس خیال سے اس کی آنکھوں میں ایک وحشت انگیز آگ بھڑک اُٹھی۔ عین اُس وقت سامنے کسی کشتی کے چلنے کی آواز سُنائی دی۔ مدّو نے اپنی کشتی میں ذرا آگے بڑھتے ہوئے پتہ لگانے کی کوشش کی۔

کشتی ہیم کے گھر کے پچھلے دروازے کے باڑیال میں جا کر رُکی، کوئی شخص کشتی میں سے کُود کر اوپر چلا گیا۔ وہ اندھیرے میں اسے پہچان نہ سکا۔ لیکن مدّو نے اپنے دل کی تیز روشنی میں اسے بھانپ لیا۔ پھر اس نے چھپ کر لگی کو دبا لیا اور لمحہ بھر سوچنے کے بعد باڑیال میں جہاں سے اٹھا تھا وہیں کشتی باندھ کر اوپر چلا گیا۔ اس موسم میں سانپوں کا بہت اندیشہ رہتا ہے۔ اوپر جاتے ہی ان کو "ہادشی"[1] کی بو آئی لیکن اس نے کوئی پروا نہ کی۔ اس کا اندازہ صحیح نکلا۔ بالکل وہی سیٹی! یکایک دل میں کچھ فیصلہ کر کے مدّو نہایت ہوشیاری کے ساتھ منصور کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور اسے مُنہ کے بل گرا دیا اور اسے پانی میں پھینک دیا جہاں اس نے ڈوبے پھینکے تھے۔ اس کے بعد فوراً پہلی جگہ لوٹ آیا۔ ہیم کی طرف اندھیرا تھا۔ ان دنوں لوگ زیادہ دیر نہیں جاگتے، گھر کے اندر شاید سب سو گئے تھے۔ اس وقت تک ہیم نے منصور کی سیٹی نہیں سُنی تھی یا سُنی

---

[1] سانپ مُنہ کھول کر جب انگڑائی لیتا ہے تو اس کے منہ سے بدبو نکلتی ہے۔ اس انگڑائی کو بنگالی میں "ہادشی" کہتے ہیں:

ہو گی لیکن دوبارہ سُننے کا انتظار کر رہی تھی۔ قریب ہی ایک جھونپڑی میں ایک مینڈک دلخراش لَے میں مسلسل گا رہا تھا۔ مدّو نے سوچا یہ اسی کو گرفتار کرانے کا سامان ہو رہا ہے، اس نے برہم ہو کر اس کی طرف مٹھی بھر مٹی پھینکی۔ مینڈک چھپاک سے کھال میں کُود پڑا۔ مدّو نے اپنے جذبۂ انتقام کو روک کر حویلی کی طرف دیکھتے ہوئے بعینہٖ منصور کی طرح سیٹی بجائی۔ چند دفعہ سیٹی بجانے پر ہیم نہایت خاموشی سے باہر آئی۔ مدّو نے پھر آہستہ سے سیٹی بجانے کی کوشش کی لیکن اسے ایسا محسوس ہوا گویا اس کا گلا خشک ہوتا جا رہا ہے۔ ہیم ذرا ٹھہر کر آواز کی طرف بڑھی۔ مدّو ذرا پرے ہٹ کر اندھیرے میں کھڑا ہو گیا۔ اس کا بدن غصّہ سے کانپنے لگا۔ جب ہیم قریب آئی تو اس نے اسے زور سے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کا جسم کس قدر نرم تھا! ہیم نے مصنوعی غصّہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا "یہاں جنگل میں سانپ اور بچھوؤں کا بھی ڈر نہیں کشتی میں بیٹھ کر کولا کی سیر کرو گے۔ یہی کہا تھا نا؟" مدّو کو ایسا محسوس ہوا گویا وہ خوشی سے بیخود ہو کر زمین پر گر پڑے گا۔ پھر بھی وہ ہیم کا ہاتھ پکڑ کر گرتا پڑتا کشتی کی طرف بڑھنے لگا۔ ہیم نے ذرا بلبلاتے ہوئے کہا "اوہ! ہاتھ کو چوٹ لگتی ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا۔ ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کر سکتے" اس شوخ جملہ نے مدّو کو اور بھی

بیخود کر دیا۔ مدّو کپکپاتے ہوئے ہیم کو کشتی میں بٹھا کر جلدی جلدی گولا کی طرف چل پڑا اور کسی نہ کسی طرح گولا تک جا پہنچا۔ ہیم نے کہا "بات کیوں نہیں کرتے؟" مدّو نے اس کی طرف ترچھی نظر سے دیکھا۔ اندھیرے میں بھی ہیم کی آنکھیں شک و شبہ سے تیز ہو گئیں۔ مدّو نے اور بھی تیزی سے کشتی چلانی شروع کر دی۔ ہیم جلد ہی سب کچھ سمجھ گئی۔ اس نے گھبرا کر پوچھا "تم کون ہو؟" مدّو کشتی چلانا بند کر کے آگے بڑھا اور ہیم کا منہ بند کرتے ہوئے کہا "خاموش! مجھے دھوکہ دے کر منصور کے ساتھ محبت کرتی ہے۔" ہیم گھبرا گئی، پھر مدّو سے ذرا دور ہٹ کر کہا "اچھا کرتی ہوں، تمہیں اس سے کیا؟ مجھے گھر لوٹا دو، ورنہ ——" مدّو نے اور بھی برہم ہو کر "تیری ہمت بہت بڑھ گئی ہے، شور مچانے سے تیری بڑی نیک نامی ہو گی۔" ہیم نے کہا: "تم مجھ پر کیوں زبردستی کرو۔" مدّو نے قریب آ کر کہا "ہیم میں تیرے پیر پکڑتا ہوں، تو ہی میرا سب کچھ ہے۔ مجھے دھوکہ مت دے!" ہیم نے کہا "تم مجھے مت بہکاؤ۔ تم میں جانوروں کی طرح گوشت پوست کے سوا اور ہے کیا؟" اور وہ ہاتھ چھڑا کر پرے ہٹ گئی۔ مدّو نے پھر کہا "ہم دونوں بچپن سے ایک ساتھ رہ کر جوان ہوئے ہیں۔ تیرے لئے میں نے کیا کچھ نہ کیا۔" "خبردار! دوبارہ میرے بدن کو ہاتھ نہ لگاؤ۔" ہیم نے کہا۔

مدّو کی آواز اب کال بیساکھی کی بجلی کی طرح پھٹ پڑی، پھر وہ ذرا دھیمے لہجے میں بولا "ہیم اتنی تیز مت ہو، تیرے بغیر میں پاگل ہو جاؤں گا"۔۔۔ آسمان سے بادل چھٹ کر ہیم کے چہرے پر کچھ روشنی پڑی، مدّو نے دیکھا اس کی آنکھیں سانپ کی طرح دہک رہی تھیں، گویا وہ مدّو کو غیظ و غضب کی آگ سے جلا کر خاک کر دینا چاہتی تھی۔ اس تھوڑی سی روشنی میں غسل گھاٹ کا منظر مدّو کے سامنے اُبھر آیا۔ اس نے پھر ہیم کو قریب لانے کی کوشش کی، ہیم اور بھی برافروختہ ہوئی لیکن مدّو کے بدن میں بیس سال کی جمع شدہ قوت کو آج ظاہر ہونے کا موقع ملا۔ ہیم کا کمزور جسم اس کی تاب کہاں سے لاتا۔ تاہم اس نے مدّو کے بازو کو زور سے کھینچا اور اس کو دانتوں سے کاٹنے لگی۔ مدّو نے تلملا کر اسے فوراً چھوڑ دیا اور اپنے آپ کو ایک خوفناک اقدام کے لئے تیار کرنے لگا۔ اس نے دل میں کہا "کیا ہیم کے دل میں اس قدر فریب تھا"۔ اس نے کہا "میں آخری دفعہ کہہ رہا ہوں، منصور سے شادی مت کر، تو میری ہے اور کسی کے یہاں نہیں جا سکتی"۔ ہیم نے کچکچاتے ہوئے کہا "کیا تم سمجھتے ہو مجھے میرے گھر نہیں پہنچاؤ گے۔ میرا باپ، میرا شوہر بدلا نہیں لیں گے؟"، مدّو نے وحشیانہ طور پر قہقہہ مارتے

۱؎ بیساکھ کے مہینے میں جو طوفان آتا ہے اس کو بنگالی میں "کال بیساکھی" کہتے ہیں۔

ہوئے کہا "بدلا کیا میں نہیں لے سکتا"؛ اور اس نے فوراً کشتی کو کھاڑی میں اُلٹ دیا اور دانت پیستے ہوئے کہا "کیا تو میری آنکھوں کے سامنے دوسرے کے گھر جائے گی؟ جا!" اس اتھاہ پانی میں دس گز ساری میں لپٹے ہوئے جسم کا ابھرنا ناممکن تھا۔ یہ انتظار کئے بغیر کہ وہ بچی یا ڈوب گئی۔ مدّو باڑیال کی طرف چل پڑا۔ اس دوران میں ہوا بالکل بند ہو چکی تھی، اور فضا میں سکون تھا اور وہ تیر کر کنارے تک پہنچا۔ کنارے پر پہنچنے کے بعد مدّو تھکے ماندے جسم اور ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ بے حسی کے عالم میں زمین پر پڑا رہا۔ اس نے اس بھیانک اندھیرے پر ایک نظر ڈالی، اس کا سارا بدن تھرتھرا اُٹھا۔ کولا ایک ناقابلِ بیان بربادی پر قہقہے لگاتا ہوا محسوس ہوا۔ ہر ہر موج کی تہ میں ہیم کے ڈوّے کے رنگ کے دو نازک ہاتھ پریشان ہو کر زمین کا سہارا تلاش کر رہے تھے لیکن موجیں تھپیڑے مار مار کر اسے غرق کئے دیتی تھیں، وہ بے قرار موجیں اس کے نازک جسم پر دست درازی کر کے اپنی گہرائیوں میں کھینچ لینے کے لئے مدہوش ہو گئی تھیں۔ مدّو نے اپنے دل میں سوچا کہ وہ ہیم کو کس کے حوالے کر آیا ہے! شاید وہ اب تک کشمکش کر رہی ہے! اسی کا نام پکار پکار کر اپنی جان بچانے کے لئے فریاد کر رہی ہے۔ اس سیلاب پر غالب آنے کے باوجود مدّو اس کی فریاد سُن رہا تھا۔ وہ دفعتاً چیخیں مارتا ہوا پھر کولا میں کود پڑا۔

جب وہ واپس آیا تو دو گھڑی رات گذر چکی تھی۔ جہاں اس نے منصور کو ہاتھ پاؤں باندھ کر رکھ چھوڑا تھا وہاں تہیم کی لاش اتار کر وہ بے حسی کے عالم میں گرتا پڑتا کشتی پر جا سوار ہوا، اس نے تھکے ماندے ہاتھوں سے اپنے گھر کی طرف کشتی چلائی۔ اس وقت بارش تو رُک گئی تھی لیکن اس کی آنکھوں کی بارش نہ رُکی۔ ہوا بند ہو جانے پر اس وقت چاروں طرف ایک گہرا سکوت طاری تھا! +

ابوالکلام شمس الدین

سڑک

موضع تمول تلا میں ایک شخص غفور علی رہتا تھا جو گوہر علی کے نام سے مشہور تھا۔ ایک دن نہ جانے اسے کیا ہوا کہ وہ کدال لے کر سڑک کو دیوانہ وار توڑنے پھوڑنے لگا۔

دیکھنے میں تو اس کا یہ فعل بڑا ہی مجنونانہ تھا۔ لیکن درحقیقت یہ کوئی اضطراری فعل نہ تھا۔ اس کے عقب میں حالات کا ایک لمبا چوڑا سلسلہ تھا جسے ہم ایک اچھی خاصی داستان قرار دے سکتے ہیں۔ اور بڑے غور اور ہمدردی سے دیکھا جائے تو ہم یقیناً اس کا جواز بھی پیش کر سکتے ہیں۔ ورنہ یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ جو سڑک گاؤں کے سب لوگوں نے مل جل کر بنائی تھی اور جس کے لئے خود گوہر علی نے اپنی زمین کا بہت سا حصہ دے دیا

تھا، وہ اسی کو دیوانہ وار تباہ کرنے کی کوشش کرے۔

تول تلا ان چھوٹے چھوٹے دیہات میں سے تھا جن کا جنگ سے پہلے باہر کی دنیا سے بہت کم میل جول تھا۔ اور لوگ وہی پرانے زمانے کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہمارے ملک کی تاریخ میں کتنی ہی سلطنتوں اور ریاستوں کے عروج و زوال کی مثالیں دکھائی دیتی ہیں۔ چنانچہ دہلی، ڈھاکہ اور مرشد آباد پر جو ایک دوسرے سے اس قدر دور واقع ہوئے ہیں، کتنے ہی خاندانوں کا آفتابِ اقبال طلوع اور غروب ہوا۔ قبیلہ ماگھ، پرتگیزوں اور مرہٹوں نے ملک کے مختلف حصّوں میں پے در پے طوفانی حملے کئے۔ لیکن یہ سب تول تلا کی زندگی میں کوئی ہلچل نہ پیدا کر سکے۔ اور تو اور انگریزی تہذیب بھی جس نے ملکی تہذیب و تمدّن کی بنیادیں تک ہلا دی تھیں، جنگ سے پہلے اس پر کوئی اثر نہ پیدا کر سکی۔ کم از کم سڑک بننے سے پہلے اس کی وضع اور ماحول میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔

پرانے زمانے کے تول تلا کی زندگی کو دیکھا جائے تو وہ بالکل ایسی معلوم ہوتی ہے، جیسے وہ کوئی رومان ہو۔ آج کل کی پست زندگی کے برعکس اس زمانے کی زندگی جدّوجہد اور شجاعت کی زندگی تھی یسنگدل قدرت کے ناسازگار عناصر کے خلاف مردانہ وار سینہ سپر ہو کر گاؤں کے

باسیوں نے کتنی ہی فصلیں اُگائی تھیں۔ ذوقِ حیات سے بہرہ اندوز ہونے کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہوئے انہوں نے اسی روایتی مردانگی اور پرانے ہتھیاروں کے ساتھ لڑائیاں لڑیں۔ شادیاں کیں اور پھر فراغت کے لمحوں میں گیتوں اور نغموں سے دل بھی بہلایا۔ ان کا بیرونی دنیا سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اور تھا تو بالکل برائے نام۔ وہ ایک خاص وضع کی زندگی بسر کرتے تھے جس میں ان کی اپنی ہی رسموں اور ریتوں کو دخل ہوتا تھا۔ بیسویں صدی کی اقتصادی تہذیب نے ان کے راہ و رسم میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ اس میں سرایت کر ہی گئی۔

آج سے تقریباً چالیس برس پہلے کا واقعہ ہے کہ اس گاؤں کا ایک نوجوان اس سے دامن چھڑا کر باہر نکل گیا۔ جب وہ واپس آیا تو وہ اپنے ساتھ روپیہ پیسہ ہی نہیں بلکہ ایک نیا تصوّر اور بلند تر معیارِ زندگی بھی لے کر آیا۔ گاؤں کے لوگ اس کو دیکھ کر ہکّا بکّا رہ گئے اور اس کے گرد جمع ہو کر ٹکٹکی باندھ کے دیکھنے لگے۔ اس نے انہیں بتایا کہ تمول تلا کی ندیوں اور نہروں سے پرے، دریائے لش کھلی اور آرکل خان کی دوسری جانب جہاں ہر کوئی سال میں کم از کم ایک بار سرکاری خزانے میں مالیہ داخل کرانے جاتا ہے۔ ایک جگہ ہے جسے "شہر" کہتے ہیں۔ جب

تک ہمارے گاؤں اور اس شہر میں میل جول نہ پیدا ہو جائے۔ ہمارے یہاں ایسی ذلیل گمنامی کی زندگی بسر کرنے میں کوئی لطف نہیں۔ ایک انسان کی طرح زندگی بسر کرنے اور زندگی کے بہتر پہلو سے روشناس ہونے کے لیئے یہ ضروری ہے کہ شہروں اور بندرگاہوں کے ساتھ تعلق پیدا کیا جائے۔ اور یہ مسئلہ فی الفور ایک سڑک تعمیر کرنے سے حل ہو سکتا ہے۔

اسی دن سے جناب علی حولدار نے عہد کیا کہ آئندہ وہ اپنی ساری قوت اور ذرائع اپنے گاؤں کی ترقی پر صرف کرے گا۔ اس نے ڈسٹرکٹ بورڈ کو بھی آمادہ کر لیا کہ جس قدر جلد ہو سکے سڑک بنا دی جائے۔ گاؤں کے دوسرے مرفہ الحال لوگوں نے بھی بڑی سرگرمی سے دیہات سدھار کا بیڑا اُٹھایا جو اُن کے خیال میں ضرور گاؤں کی سماجی ترقی کا باعث ہو گا۔ اس سلسلہ میں زیادہ مشکل گوہر علی جیسے غریب کسانوں کے سبب پیدا ہوئی۔ ان کی زمینوں کا جو حصّہ سڑک کی بھینٹ چڑھتا تھا۔ وہ دینے کو تیار نہ تھے۔ گوہر علی نے کہا "میرے پاس تو تقریباً پانچ "کورہ" زمین ہے۔ اگر دو ایکڑ زمین سڑک کی نذر ہو جائے تو میرے پاس رہے گا کیا جس سے میں زندگی بسر کر سکوں"۔

جناب علی نے جواب دیا "میاں! تم اب تک فصل بیچ کر ہی روپیہ کمانا جانتے ہو۔ ذرا سڑک بن جانے دو۔ پھر دیکھنا آپ سے آپ آمدنی

کے کیا کیا دروازے کھلتے ہیں۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ اس سڑک کو محض سڑک مت سمجھو۔ یہ تو کچھ اور ہی چیز ہے۔ اس وقت تم یہ بات نہیں سمجھ سکتے۔ جب یہ سڑک بن جائے گی تو دیکھنا یہ کس طرح ایک نئی زندگی کا دروازہ کھول دیتی ہے"۔

یہ بات گوہر علی کی سمجھ میں آئی یا نہیں، اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن جس شد و مد سے اس نے اس کی مخالفت کی تھی، اس میں کوئی فرق نہ آیا۔ تاہم سڑک کے بارے میں جو کچھ کہا گیا تھا، وہ جناب علی جیسے بڑے آدمی کی زبان سے نکلے تھے۔ اور پھر دریا کی دوسری طرف جس خواب کی دنیا کا نقشہ اس نے پیش کیا تھا۔ اس نے گوہر علی کے دل میں عجیب و غریب تصورات کا ایک طلسم پیدا کر دیا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ سڑک ایک اور ہی زندگی کا راستہ نہیں کھول دے گی۔ چنانچہ جناب علی کے گھر سے اٹھ کر گوہر علی اپنی زمین کے اس حصے میں کھڑا ہوا جسے سڑک میں شامل ہونا تھا۔

اب بھی اگر ہاڑ مہینے کے آخر میں اس کے پاؤں ٹخنوں تک زمین کی نرم نرم مٹی میں دھنس گئے تھے فصل پک رہی تھی۔ بالیں پوری طرح بھر کر قطار در قطار جھک رہی تھیں۔ اور بعض کیچڑ جیسی زمین پر بالکل لیٹ گئی تھیں، کیونکہ زمین کا یہ حصہ ایک گلتے سڑتے بند جوہڑ

کو پُر کر کے بنایا گیا تھا۔ اس میں کسی سال بھی اچھی فصل پیدا نہیں ہوئی تھی۔ پانی جمع ہو ہو کر آدھی سے زیادہ فصل کا ستیاناس کر دیتا تھا۔ اس کے باوجود جب گوہر علی اس زمین کو دیکھتا تھا تو اس کا دل باغ باغ ہو جاتا تھا۔ آج نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر اس کے دل میں نفرت پیدا ہوئی۔ اس نے سوچا وہ کب تک اس کی معمولی سی پیداوار کو دانہ دانہ کر کے چُنتا رہے گا۔ اس سے کہیں بہتر یہ ہوگا کہ وہ نئی زندگی کا خیر مقدم کرے۔ اور تو اور خود جنابت علی نے یہ کہہ دیا تھا کہ اگر ہم اُس ڈگر سے پرے ہٹ کر چلیں، جس پر ہم برسوں سے چل رہے ہیں تو شادمانی اور خوشحالی خود بخود ہمارے قدم لے گی اور ہم صحیح معنوں میں انسانوں کی طرح زندگی بسر کر سکیں گے۔ آخر اس بات کے آزما لینے میں کیا ہرج ہے؟ اگر جنابت علی جیسا شخص جس کا باپ آج سے دس سال پہلے مُٹھی بھر دانوں کے لئے صبح سے شام تک کام میں جُتا رہتا تھا، دوسری قسم کی زندگی اختیار کر کے بے انتہا دولت حاصل کر سکتا ہے، اور خوشحال بن سکتا ہے، تو وہ کیوں نہ اپنی قوت اور ہمت سے کام لے کر اپنے مقدر کو بدل ڈالے؟

گھر واپس آکر اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اس نے اپنی زمین مٹرک کے لئے دے دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کی بیوی نوعمر ہونے

کے باوجود بہت سیانی تھی۔ اس نے فوراً پوچھا "تو پھر ہم کھائیں گے کیا؟"

گوہر علی نے جواب دیا "اگر ہم ان باتوں کو سوچیں تو ہمارا ملک اور قوم خوشحال کیسے ہوگی؟ سب کے فائدے کے لئے ہمیں اپنی چھوٹی چھوٹی آسائشوں کو خیرباد کہہ دینا چاہئے"۔ چنانچہ گوہر علی نے طوطے کی طرح وہی الفاظ دُہرا دیئے جو جناب علی کی زبان سے نکلے تھے۔ اس کی بیوی نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ملک اور قوم کی خدمت سے تمہارا مطلب کیا ہے۔ مولوی صاحب ابھی کہہ رہے تھے کہ سڑکیں وغیرہ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان سے ہماری مصیبتیں بہت بڑھ جائیں گی۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ گاؤں سے باہر جانے کا خبط جو ہم میں آجکل پیدا ہو گیا ہے کوئی اچھی علامت نہیں"۔

گوہر علی نے کہا "ان کی باتوں پر مت جاؤ۔ جب بھی کوئی نئی بات پیش کی جاتی ہے بعض لوگ خواہ مخواہ اس کی مخالفت شروع کر دیتے ہیں"۔ اس کی بیوی پھر بھی اپنی بات پر اڑی رہی اس نے کہا "میں مانتی ہوں کہ انسانوں کی خدمت کا جذبہ بہت اچھا ہے لیکن کیا ہم لوگ اس کی ہمت رکھتے ہیں؟ جن لوگوں کے یہاں غلہ وافر ہوتا ہے وہ یہ کام کر سکتے ہیں۔ سڑک کا ہمارے ساتھ کیا واسطہ؟"

گوہر علی نے جھٹ جواب دیا "آخر تم عورت ہو نا۔ عورتیں ان

باتوں کو کیا جانیں؟ انسانی فطرت ہے کہ وہ ایسی باتیں کرنا چاہتی ہے جو اس کی دسترس سے باہر ہوں۔ جو لوگ آگے ہی خوشحال ہیں وہ ان باتوں کی کیوں پرواکریں؟ معاملہ تو صرف ہماری خوش حالی کا ہے۔"

بعد میں گوہر علی ہاجرہ کو اپنے کھیت کے اس اونچے کنارے پر لے گیا جہاں ان کی جھونپڑی بنی ہوئی تھی۔ اس نے اس سڑک کی کیفیت بیان کی جس کا جناب علی نے ذکر کیا تھا۔ اس نے آسمان کے بحرِ نیلگوں پر تیرتے ہوئے سفید بادلوں کی اجلی اجلی کشتیوں کے تلے جگمگ جگمگ کرتے ہوئے افق کی طرف اشارہ کیا۔ جنگل کے سبز کنارے سے پرے جس کو سن کے پودے بے اختیار جھوم جھوم کر اجاگر کر رہے تھے۔ افق کسی دور دراز دنیا کے خواب میں محو ہوتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور پھر گوہر علی نے جناب علی کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا "کیا یہ محض سڑک ہے" یہ تو ایک نئی زندگی کا دروازہ کھول دے گی۔ مسرت اور خوشحالی۔۔۔۔"

اسی طرح ہاجرہ اور وہ اپنے تخیل میں سڑک کو پھیلاتے چلے گئے دور اور دور، اور دور ۔۔۔۔ یہاں تک کہ وہ دنیا کے آخری حدود تک پہنچ گئی۔ ان کے دل نے اس زندگی کے خلاف بغاوت کر دی جس کے وہ مدتوں سے عادی ہو چکے تھے۔ ان کا تخیل ایک بہتر اور زیادہ بلند زندگی کی تلاش میں مطلق العنان پرواز کرنے لگا۔ آیا یہ سڑک واقعی ان کی دلی خواہشات کو پورا

کرے گی یا نہیں۔ وہ اس کے متعلق بحث نہیں کر سکتے تھے لیکن
ان کا دل ایک بے پناہ یقین سے بھرا ہوا تھا جنابؔ علی نے جو کچھ
کہا تھا گوہر علی نے اسے اس قدر بڑھا چڑھا کر پیش کیا کہ ہاجرہ جیسی
سیدھی سادی دیہاتی لڑکی یقین اور شک میں ڈانوا ڈول ہونے
کے باوجود دل میں ایک زبردست ولولہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی۔
وہ گوہر علی کے ہاتھوں کو بڑے اشتیاق سے مس کرتے ہوئے بار بار
پوچھتی "کیا یہ سچ ہے؟"

گوہر علی جواب دیتا "مستقبل تمہیں یہ خود ہی بتا دے گا۔"

لیکن مستقبل تو ایک اتھاہ چیز ہے۔ انسان خیال کرتا ہے کہ اس
نے اس کی تہ پالی ہے لیکن وہ اس کی گرفت سے باہر نکل جاتا ہے۔
چنانچہ گوہر علی بھی اس کا احاطہ کرنے سے قاصر رہا۔

آخر کار تمام آزمائشوں، دشواریوں اور مخالفتوں پر غالب
آکر سڑک تعمیر ہو گئی۔ اس موقع پر جنابؔ علی نے دو بچھڑے ذبح کر کے
مزدوروں کو دعوت دی جس میں گاؤں کے اکثر لوگ شریک ہوئے۔
رات کو گانے والوں کی ایک پارٹی آئی۔ اور خوب گانا ہوا۔ گاؤں کی
بے کیف، روکھی پھیکی زندگی میں شاید ہی کوئی ایسی تقریب ہوئی ہو۔
اس کے بعد لوگوں نے شہر میں آنا جانا شروع کر دیا اور ہر کوئی

اپنے ساتھ اس کی تہذیب کا کوئی نہ کوئی نمونہ لے کر آیا۔ جب سڑک کا پہلا پہلا طلسمی اثر دور ہو گیا تو لوگ سڑک کے کنارے اپنے ڈھور ڈنگر باندھنے لگے۔ جب وہ کھیتوں میں کام کرتے کرتے تھک جاتے تو وہ اس کے کنارے بیٹھ کر حقّہ پیتے اور غپیں ہانکتے۔ اُدھر بعض نوجوان گاؤں کو چھوڑ کر دھن دولت کی تلاش میں شہر کو روانہ ہو جاتے۔

ایک دن گوہر علی نے کپڑے کی ایک گٹھڑی باندھی اور ہاتھ منہ دھو، سر میں تیل ڈال، سج دھج کر ہاتھ میں چمکدار موٹھ والی چھڑی لے کر، شہر میں تین دن رہنے کے لئے چل پڑا۔ اب اسے اپنی آنکھوں سے وہ سب باتیں دیکھنے کا موقع ملا جن کی جناب علی نے ایسی جادو بھری تصویریں پیش کی تھیں۔ واقعی شہر کے بارے میں جو کہانیاں بیان کی گئی تھیں۔ وہ بالکل صحیح تھیں۔ اس میں ایسے لوگ بستے تھے جن کی زندگیاں خوشی اور خوش نصیبی سے بھرپور تھیں۔ ان کی ہر جنبش، ہر انداز، ہر طریقہ، بات چیت، رہن سہن قابل رشک معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود دال میں کچھ کالا کالا ضرور تھا۔ ان لوگوں کو سمجھنا، ان کے دل کی تہ تک پہنچنا دشوار تھا۔ انہیں اس جیسے غریبوں سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اور کوئی اس سے ایک دو منٹ بھی بات کرنے کو تیار نہ تھا۔ کسی نے بھی اس سے یہ نہ پوچھا کہ وہ کہاں

سے آیا ہے اور کہاں رہتا ہے۔ اس کے گاؤں میں ہر کسی کو خواہ وہ اجنبی ہی کیوں نہ ہو سلام کرنے کا جو دستور تھا یہاں اس کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ بلکہ یہاں تو کسی نے نظر اٹھا کر دیکھا ہی نہیں کہ وہ ہے کون؟ اور اگر اتفاقاً ایک دو نے دیکھ بھی لیا تو گوہر علی کچھ پریشان ہو گیا۔ ان کی نگاہوں میں کوئی گرمجوشی یا شفقت نہ تھی۔ بلکہ محض حقارت تھی۔ البتہ شام کے وقت بازار میں چلتے وقت اس کے دل میں بڑا ولولہ پیدا ہوا۔ اس کے دونوں طرف خوش پوش چنچل لڑکیوں کی قطاریں تھیں۔ بعض تو اسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتیں اور بعض اس کا خیر مقدم کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ ان میں سے ایک نے اس کے متعلق کوئی بات کہی جس سے دوسری لڑکیاں بہت خوش ہوئیں اور وہ کچھ گھبرا گیا۔ اسے ذرا بھی سمجھ میں نہ آیا کہ بات کیا ہے۔ پھر بھی جس انداز سے ایک نے اسے دیکھا تھا۔ وہ اس کے دل پر گہرا اثر چھوڑ گیا۔

اگلی شام وہ پھر اسی طرف چل پڑا۔ وہ لڑکی اسی جگہ کھڑی تھی۔ جب گوہر علی اس کے پاس سے گزرا تو اس نے اس کی طرف بڑے پیار سے مسکرا کر دیکھا۔ گوہر علی کا سر چکرا گیا۔ وہ اس جگہ حیرانی سے مُنہ کھولے نیم مدہوشی کے عالم میں دیر تک کھڑا رہا۔ لڑکی نے اس کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا "آؤ"

گوہر علی بھونچکا ہو کر اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ لڑکی اسے بانسوں اور گھاس پھونس کی بنی ہوئی ایک جھونپڑی میں لے گئی۔ اس کے اندر ایک طرف کھاٹ بچھی تھی اور دوسری طرف ایک چھوٹی سی لالٹین۔ لڑکی نے لالٹین کو زیادہ روشن کرنے کے لئے اس کی بتّی اُکسائی اور پھر گوہر علی کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اس نے پوچھا "تم یہاں گاؤں سے آئے ہو؟" گوہر علی نے سر ہلا کر کہا "ہاں"۔

"بہت خوب! تمہاری ڈب تو بہت بھاری نظر آتی ہے۔ اس میں دس روپے سے کم پونجی کیا ہوگی۔ لاؤ تو میں دیکھوں"۔

یہ کہہ کر اس نے اس کی ڈب کو ٹٹولنا شروع کیا۔ گوہر علی کے رگ وپے میں ڈر کے ساتھ ساتھ ایک لطیف سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس نے پہلے تو اُس چھوٹے سے نرم و نازک ہاتھ کو جو اس کی ڈب کو ٹٹول رہا تھا روکنے کی کوشش کی لیکن آخر کار اس کے نازو ادا سے لاچار ہو کر رہ گیا۔

کچھ دیر بعد اس کے پیسے ہتیا کر لڑکی نے کہا "بس اب اُٹھ کھڑے ہو۔ اگر تم یہاں زیادہ دیر رہنا چاہتے ہو تو اور پیسے لاؤ۔ اب تم چلے جاؤ"۔

گوہر علی ہر روز اس لڑکی میں کیا کشش پاتا تھا یہ تو وہی جانتا تھا۔ لیکن شہریوں کے حسنِ سلوک اور ہمدردی کے متعلق جو خیالات

اس کے ذہن میں بٹھائے گئے تھے۔ وہ بالکل پاش پاش ہو گئے۔ اس نے پوری شدت سے یہ محسوس کیا کہ شہروں میں ہر بات پیسے کی کسوٹی پر پرکھی جاتی ہے۔ یہاں روپیہ پیسہ ہی سب کچھ ہے اور زندگی پر تمام تر اس کا اختیار ہے۔ لوگ جذبات یا دل کو کسی شمار میں نہیں لاتے۔ وہ بڑا اداس اور تنہا محسوس کرنے لگا۔ تیسرے دن وہ شہر کے خلاف بڑی نفرت اور غصّہ سے بھرا ہوا دل لے کر گاؤں واپس چلا آیا۔

راستہ بھر وہ خیالات میں کھویا رہا۔ آخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ بھی اپنے مستقبل کی بنیاد دولت ہی پر رکھے۔ چنانچہ اس نے روپیہ کمانے کے مختلف طریقے سوچنے شروع کئے۔ اپنی ناکامیوں کے باوجود وہ اس محاذ پر ڈٹا رہا کیونکہ اس سے پلٹ آنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ بالخصوص اپنی بیوی کے سامنے اس شد و مد سے ڈینگیں مارنے کے بعد ــــ اور صرف وہی کیا سب سبزیاں اور مچھلیاں وغیرہ سڑک کے ذریعہ شہر میں بکری کے لئے بھیجنے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ عالم ہوا کہ بے نام بُوٹیاں اور پتّے وغیرہ بھی جو گاؤں میں بے تحاشا اُگتے تھے۔ شہر میں دھڑا دھڑ بکنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک دن ہاجرہ نے گوہر علی سے بڑی مزے کی بات کہی۔ وہ بولی "اے میاں! جس طرح تم نے بے تحاشا چیزیں بیچنی شروع کر دی ہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ ایک دن میں بھی بِکاؤ مال

میں شامل ہو جاؤں گی۔"

گوہر علی اب دونوں ہاتھوں سے دھن کما رہا تھا۔ تین سال کے عرصے میں اس کی کٹیا کی گھاس پھونس کی چھت کی جگہ ٹین کی چھت نے لے لی جس کو دیکھ کر جنابؔ علی پر یقین نہ کرنے والے لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سڑک پر دیوانی اور فوجداری عدالتوں کی طرف آمد و رفت بھی شروع ہو گئی۔ دیہاتیوں کی سیدھی سادی زندگی میں سازش اور مکّاری بھی شامل ہو گئی۔ سڑک کے دونوں طرف کتنے ہی گلی کوچے بن گئے جن میں خدا جانے کتنے ہیر پھیر تھے۔ تول تلا سچ مچ بڑا ایچ در پیچ قصبہ بن گیا۔ جس کا اس کے باشندوں پر بڑا اثر پڑا۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک دن کسی شخص کی چند گائیں چرتی چرتی کسی اور کے کھیت میں جا نکلیں۔ جس پر جھگڑا ہو گیا اور ایک آدمی مارا گیا۔

جب تک جنابؔ علی کو اس کی خبر ہو اور وہ موقعۂ واردات پر پہنچے۔ سڑک کا کافی حصہ بھی نابود ہو چکا تھا کیونکہ لڑنے والوں نے اس کے اکھڑے اکھڑے پتھر اٹھا اٹھا کر ایک دوسرے پر خوب گولہ باری کی۔ جنابؔ علی نے سب کو بلایا اور کہا "کیا ہم نے سڑک اسی لئے بنائی تھی؟ ارے گنوار وحشیو!"۔ لیکن اس کے الفاظ کا

لوگوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ سب تو تھانے، عدالت اور مقدمے کی فکر میں تھے۔

اسی اثنا میں جنگ چھڑ گئی۔ اس کی لہریں بھی اچھل اچھل کر سڑک کے راستے گاؤں تک پہنچیں۔ گاؤں کی تاریخ میں یہ ایک نادر واقعہ تھا۔ یہ معمولی جگہ کبھی کسی انقلاب سے دوچار نہیں ہوئی تھی۔ اور نہ اس پر کوئی افتاد پڑی تھی۔ کم از کم اس میں کبھی کوئی سیاسی ہنگامہ رونما نہیں ہوا تھا۔ لیکن جو کچھ گزشتہ کئی صدیاں نہیں کر سکی تھیں، وہ انگریزوں کی دوسو سال کی حکومت نے کر دکھایا۔

اناج کا بھاؤ تیزی سے چڑھنے لگا۔ زندگی کے سوا ہر چیز کی قیمت بڑھ گئی۔ دھیرے دھیرے سڑک کے راستے قحط بھی آن پہنچا۔ اور چور بازاری اور اس قسم کے اور ڈھیرے بھی زور و شور سے ریلے مار مار کر آنے لگے۔ ان کی اُمڈتی ہوئی موجیں اپنے ساتھ امن کو بہا لے گئیں۔

ساتھ ہی یہ بھی ہوا کہ سرکاری حکام سڑک کے راستے گاؤں میں آنے لگے۔ یہ لوگ اپنی جیبیں رشوتوں سے بھر بھر کر واپس جاتے۔ شہر کے ایک بڑے رئیس کا باورچی لطفو ایک شخص اصغر اللہ کی جوان بیٹی کلثوم کو لے بھاگا۔ لام سے واپس آتے ہوئے یوسف کی بیوی ایک نامعلوم بیماری کا شکار ہو کر سینکڑوں پھوڑوں کے ساتھ دنیا سے

رخصت ہوگئی۔ فوجیوں کی رسد کے لئے ٹھیکیدار اور دوسرے لوگ سبزیاں، ترکاریاں۔ لکڑی، کاٹھ اور مرغیاں وغیرہ لینے آتے۔ اتفاق سے گوہر علی کی ان میں سے ایک کے ساتھ دوستی ہوگئی۔ قحط کا زمانہ تھا۔ گوہر علی بڑی مشکل میں تھا۔ اس نے سوچا کہ اپنے نئے دوست کے اثر و رسوخ سے آمدنی بڑھانے کی کوئی صورت پیدا کرے۔

لیکن اس کی کوششوں کے باوجود کچھ بھی بن نہ پڑا۔ صرف ایک صبح ہاجرہ گھر سے کہیں غائب ہوگئی۔ وہ دوست اس کے بعد کبھی دکھائی نہ دیا۔ پُوچھ گچھ کرنے پر سات میل دور ایک کسان سے پتہ چلا کہ اس نے ایک دن صبح سویرے ایک عورت کو کسی مرد کے ساتھ جاتے دیکھا تھا۔

قحط نے گوہر علی کو ظاہری حیثیت سے پہلے ہی قلاش کر دیا تھا۔ اب وہ روحانی حیثیت سے بھی قلاش ہوگیا۔ دو دن وہ بالکل چپ رہا۔ اس کے جذبات غم و غصّہ، افسوس کسی شکل میں بھی ظاہر نہ ہوئے ایک دن وہ دفعتہً دیوانہ وار باہر نکلا۔ ہاتھ میں کدال اُٹھائی اور سڑک کے اس حصّے کی طرف بھاگا، جس کے لئے اس نے اپنی زمین کی بھینٹ دی تھی۔ گاؤں میں خبر مشہور ہوگئی کہ گوہر علی اپنی بیوی کے کھو جانے پر دیوانہ ہوگیا۔ سب لوگ اسے دیکھنے کے لئے دوڑ دوڑ کر آنے لگے جب

وہ وہاں پہنچے تو گوہر علی سڑک پر اندھا دھند کدالوں پر کدالیں برسا رہا تھا۔ آخر یہی سڑک ہی تو تھی جو اس کی تمام مصیبتوں کا باعث بنی۔ اس لئے وہ اس کو بے تحاشا زمین کے ساتھ ہموار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیا وہ یہ کام کر بھی سکے گا یا نہیں ؟ یہ بات اسے سُوجھی ہی نہیں۔

سب لوگ اس سے پوچھنے لگے "ارے گاؤدی! یہ کیا کر رہا ہے؟"

اس نے کدال روکے اور آنکھیں اُٹھائے بغیر جواب دیا:۔

"اس سڑک کا صفایا کر رہا ہوں"۔

"وہ کیوں ؟"

اس لئے کہ اس سڑک کا بنانا ایک غلطی تھی۔ ایک زبردست غلطی! اس کو ہرگز نہیں بننا چاہئے تھا"

گوہر علی نے کدال سے تابڑ توڑ چوٹیں برساتے ہوئے یہ الفاظ کچھ اس طرح کہے گویا وہ اپنے دل سے کوئی بات کہہ رہا ہو——

ہاں مگر یہ بات بھی پوچھنے کی تھی کہ صحیح روش کیا تھی۔ گوہر علی کو جانے دیجئے۔ کیا وہ لوگ خود بھی یہ جانتے تھے یا نہیں ؟

محی الدین

ترجمہ: یونس احمر

ڈاکٹر مارنو

وہ جیسے ایک ہی شکل کے دو جُڑواں بھائی تھے۔ ایک کو دیکھ کر دوسرے کا دھوکہ ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک ہی شخص دو طرح کی پوشاک پہن کر ہمیں چکرانے کی کوشش کر رہا ہے۔

لیکن میں ایک ہی شکل کے جن دو آدمیوں کی کہانی لکھنے بیٹھا ہُوں وہ جُڑواں بھائی نہیں تھے — اور نہ ان کا تعلق ایک سماج اور ایک قوم سے تھا۔

باقر میاں کا بچپن تعلقہ کی کسی گلی میں گزرا تھا۔ وہاں آس پاس کے لونڈے فرنگی اور کرسٹان لڑکوں کے ساتھ سارا سارا دن گولی کھیلتے کنکوے اُڑاتے اور انگریزی زبان اس طرح بولتے تھے جیسے ان کی اپنی

زبان ہو۔ باقر میاں بھی بچپن ہی سے فرنگی لباس پہننے لگے تھے۔

فرنگی لڑکے مارٹو کی شکل بھی باقر میاں سے ملتی جلتی تھی۔ وہ اپنے مالدار باپ کی دولت کے طفیل غیر ملک سے فلسفہ میں ڈاکٹری کی ڈگری لے کر واپس لوٹا تھا۔ اور باپ کے چھاپہ خانہ کا واحد مالک بن گیا تھا۔

اس کے بعد بیالیس سال کی عمر میں یکایک دونوں کی ملاقات کلکتہ میں ہو گئی۔

واقعہ معمولی قسم کا تھا، باقر میاں نوکری کی تلاش میں کسی طرح ڈاکٹر مارٹو تک پہنچ گئے۔

اُس وقت ڈاکٹر مارٹو باہر جانے کی تیاری میں ڈرائنگ روم کے دروازے کے سامنے آئینہ کے پاس کھڑے اپنا چہرہ دیکھ رہے تھے، اُنہوں نے اپنا چہرہ دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ عمر بیالیس سال کی ہو چکی تھی، چہرہ بھرا ہوا تھا۔

لیکن یکایک اپنی شکل سے ملتی جلتی ایک اور شکل دیکھ کر وہ چونک پڑے۔ اُنہیں بیحد حیرت ہوئی۔

انہوں نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ٹھیک ان کی صورت کا ایک شخص چُپ چاپ گھر کے اندر داخل ہو گیا تھا۔ نو وارد نے بڑے ہی عاجزانہ انداز سے کہا "حضور آپ کا نام سُن کر یہاں تک آنے کی جُرأت

کی ہے۔ معلوم ہوا تھا کہ آپ غریبوں کے سرپرست ہیں۔ اگر آپ مجھے کوئی معمولی سی بھی ملازمت دے کر میری مدد کریں تو......"

مآرنو نے قطع کلام کرتے ہوئے جواب دیا "ملازمت! کس قسم کا کام کرسکو گے؟" اس کے بعد وہ رک گئے پھر بولے "بہت اچھا، میرے پریس میں اسٹور کیپر کی جگہ خالی ہے، کرسکو گے یہ کام؟"

اس نے جواب دیا "آپ کی مہربانی ......"

مآرنو نے بات کاٹ کر پوچھا "نام کیا ہے تمہارا؟"

"باقر میاں"

"خاندان میں کتنے افراد ہیں؟"

"کُل پانچ ہیں حضور"۔ باقر میاں نے جواب دیا اور اُسے محسوس ہوا جیسے پانچ کے بوجھ تلے وہ دب کر رہ گیا ہے ——

ڈاکٹر مآرنو کو اس شخص پر بڑا رحم آیا —— رحم کھانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اس سے بہت ملتا جلتا تھا۔ مآرنو نے سوچا "آخر دونوں کی شکل ایک کیسے ہوگئی؟" مآرنو کے فلسفیانہ ذہن میں بار بار یہی سوال چکّر کاٹنے لگا۔

اس کے بعد اب میں جن دنوں کی بات کر رہا ہوں اُن دنوں ہمارے باقر میاں ملازمت چھوڑ کر بیکاری کی زندگی گزارنے لگے تھے۔

جسے آوارہ گردی کی چاٹ لگ جاتی ہے اُسے گھر کے بندھن جکڑ کر نہیں رکھ سکتے۔ ہمارے باقر میاں شروع ہی سے لاابالی طبیعت کے آزاد منش انسان تھے۔ یکایک کلکتہ کی شاہراہ پر موٹر کا ہارن سن کر نہ جانے کتنے دنوں تک وہ فٹ پاتھ سے نیچے نہیں اُترے اور کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ وہ حادثہ کا شکار ہوتے ہوتے بچے۔

باقر میاں دل ہی دل میں کہتے کہ بس تھوڑی سی کسر رہ گئی تھی، بال بال بچا ہوں مگر موٹر تھی بڑی خوبصورت۔ کاش میرے پاس بھی ایک موٹر ہوتی۔

موڑ کے لیٹر بکس کے اوپر لال اور نیلے رنگ کے حروف میں چھپا ہوا سینما کا ایک پوسٹر چسپاں تھا اور اُسی کے قریب ٹیلیفون پوسٹ پر ٹین کی پلیٹ لگی ہوئی تھی جس پر تحریر تھا ـــــ "سیونگ سرٹیفکیٹ خریدیئے" بالکل اس سے متصل چار منزلہ عالیشان مکان تھا ـــــ اس مکان کو دیکھ کر باقر میاں نے دل ہی دل میں کہا ـــ "یہ مکان میرا ہوتا تو نہ جانے کیا کرتا ـــــ کم سے کم ڈاکٹر مارلو کی طرح آرام سے تو رہتا۔

اور یکایک موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دی ـــــ باقر میاں آواز سُن کر فوراً دو قدم سرک گئے ـــــ وہ بڑبڑانے لگے ـــ "ہُنہ، جیسے وہ موٹر کا ہارن بجا کر ہم سے کہتے ہیں کہ ہٹ جاؤ بادشاہ سلامت تشریف

لارہے ہیں۔"

باقر میاں دل ہی دل میں یہ بات سوچتا رہا اور اُسے خیال آیا جیسے یہ موٹر والے اس بات کا بھی اعلان کرتے ہوں، دیکھو ہم کتنے حسین وجمیل ہیں، عیش وآرام ہمارے قبضے میں ہیں، تم سے ہزاروں لاکھوں گُنا بہتر ہیں اور تم ـــــ تم کتنے چھوٹے اور پست ہو!

باقر میاں کے دل میں نفرت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ اسے ڈاکٹر مارنو کا خیال آیا۔ دونوں کی عمر برابر ہے اور دونوں انسان ہیں مگر ڈاکٹر مارنو علم، عقل اور دولت میں اس سے کتنا آگے ہے ـــــ بہت آگے۔

●

باقر میاں نے ڈاکٹر مارنو کے چھاپہ خانہ میں پورے سات سال کام کیا۔ اُن کا چھاپہ خانہ بہت بڑا تھا۔ ڈاکٹر مارنو کی علمیت وقابلیت، ان کی دولت وحشمت اور سب سے زیادہ ان کی حسین بھانجی روزا اس کے دل میں حسد اور عناد کی آگ روشن کر دی۔

حسد ونفرت کی آگ جتنی بھڑکتی گئی باقر میاں اُسی رفتار سے شراب کا عادی بنتا گیا۔ اس کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مہینے کے آخری دنوں میں چالیس روپے تنخواہ لے کر چھاپہ خانہ کے باہر آکر جب اُس نے حساب کیا تو معلوم ہوا کہ قرض اسّی روپے تک بڑھ چکا ہے

لیکن اس کے باوجود اُس نے شراب کی مقدار میں اور اضافہ کردیا۔

اتفاق کی بات ایک دن ڈاکٹر مارنو کی گھڑی چین سمیت چوری ہوگئی۔ اور پھر کچھ دنوں بعد چھاپہ خانہ سے ایک درجن پیتل کی چھڑیاں غائب ہوگئیں —— یہ ساری چیزیں ایک دن باقر میاں کی خانہ تلاشی میں برآمد ہوئیں۔

ڈاکٹر مارنو نے ہنس کر کہا "سوچتا ہوں آئندہ ماہ سے تمہاری تنخواہ ساٹھ روپے کردوں —— اور یہ لو ایک ماہ کی تنخواہ پورے چالیس روپے —— کیا سونے کی گھڑی تم نے فروخت کردی؟ میری سالگرہ کے موقعہ پر اباجان نے مجھے تحفہ میں وہ گھڑی دی تھی"۔

باقر میاں خاموش سنتا رہا۔ اور اس کے بعد چالیس روپے لے کر وہ چھاپہ خانہ سے جو باہر نکلا تو پھر اس نے وہاں کا رُخ نہیں کیا۔

ڈاکٹر مارنو نے نہ تو پولیس میں رپورٹ کی اور نہ اُس کے خلاف کوئی سخت قدم اُٹھایا بلکہ اُلٹا اس کے ساتھ ہمدردی کی لیکن باقر میاں کے دل کے اندر اُس دن سے عداوت کی آگ اور زور سے بھڑکنے لگی۔

•

اور پھر اس کے بعد آج سینما ہاؤس کی ملازمت ہے تو کل کارنیوال کی مینیجری ہے —— اور اس طرح ایک کے بعد دوسری ملازمت کرتے

کرتے اُس نے تنہا آوارہ گردی شروع کر دی۔

اُس نے ایک ہی جست میں بڑا آدمی بننے کے بہتیرے جتن کئے۔ ایک بار جعلی نوٹ بنانے اور دو بار فریب دہی کے جُرم میں کئی سال قیدی کی زندگی بھی گزاری۔ آخری بار جب وہ جیل سے رِہا ہوا تو پھٹی قمیص اور پینٹ پہن کر وہ سیدھا سندر یاپٹی کی مسجد میں آیا اور امام صاحب کے سامنے کھڑا ہو کر بولا ــــ "میں کرسچین ہوں، مسلمان بننا چاہتا ہوں۔ اسلام کے اصول مجھے بیحد پسند آئے ہیں"۔

اور باقرمیاں ازسرِنو مسلمان ہوا۔ اس کی قسمت اچھی تھی۔ پہلے ہی دن بعد نمازِ جمعہ ایک بڑا سا رُومال بچھا کر اس نے اسلام اور اس کے اصولوں پر ایسی جامع اور منطقی تقریر کی کہ سامعین یک زبان ہو کر مرحبا مرحبا بول اُٹھے اور پھر اس کے بعد پیسوں کی بارش شروع ہوئی۔ اس نے گنے تو پورے دوسو اکتیس روپے تین آنے ملے تھے۔

ان پیسوں کو رومال میں باندھ کر وہ سیدھا چورنگی کے کسی ریستوران میں داخل ہو گیا ــــ اس کے بعد سے چندہ نہیں ملا۔ البتہ دو ایک بڑے لوگوں نے اُسے ملازمت کی اُمید دلائی مگر ملازمت کر کے وہ ڈاکٹر مارٹو کیسے بن جائے گا۔ اُس کا مقابلہ کرنے کے لئے کم از کم لاکھ روپیہ ہونا ضرور ہے ــــ علمیت وقابلیت کی کوئی ضرورت نہیں،

ایک سکریٹری رکھ کر سارا کام انجام دیا جا سکتا ہے۔

باقر میاں دل ہی دل میں کہتا ”تمنائیں بہت ساری ہیں مگر جیب تو خالی ہے“ اور پھر قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔

●

ایک دن وہ ایک پارک کے اندر گیا اور ایک درخت کے نیچے سبز رنگ کی بنچ پر بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے کچھ پنیر اور سوکھی ہوئی ڈبل روٹی نکالی۔ چاروں طرف نظریں دوڑائیں کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ اور جب اُسے اطمینان ہو گیا تو سوکھی روٹی میں پنیر لگا کر کھانا شروع کیا

کچھ دیر بعد ایک لڑکا جس کی عمر کوئی بارہ تیرہ سال کی ہوگی اس کے قریب آیا۔ اُس کا جسم چہرہ سے کہیں زیادہ سیاہ تھا۔ جسم پر پھٹی ہوئی ایک قمیص اور ایک لُنگی تھی۔ لڑکا باقر میاں کے پاس بیٹھ گیا۔

باقر میاں دوسری طرف مُنہ پھیر کر سوکھی روٹی چبانے لگا۔

لڑکے نے جیب سے شکر قند نکالی اور اِدھر اُدھر دیکھ کر کھانا شروع کر دیا۔ کچھ دیر اسی طرح گذری —— کچھ پرے درختوں کی جھاڑیوں کے اندر ایک مریض قسم کا یورپین سپاہی کافی طویل القامت اور بھرے بھرے جسم والی عورت کے ساتھ اظہار عشق کر رہا تھا۔ یکایک لڑکے کی

نگاہ باقر میاں پر پڑی وہ کھڑا ہو گیا اور سامنے آ کر بولا ‘‘سلام صاحب! آپ یہاں کہاں؟’’

باقر میاں نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔

لڑکے نے ہنستے ہوئے کہا ‘‘نہیں مجھ سے بھول ہو گئی میں نے سمجھا آپ ڈاکٹر مارنو ہیں ـــــ ٹھیک آپ ہی جیسی شکل ہے اُن کی’’۔

باقر میاں لڑکے کی بات سن کر چونک پڑا۔ پھر سوچنے لگا کہ کیا واقعی اس کی شکل ڈاکٹر مارنو جیسی ہے۔ اس نے لڑکے سے پوچھا ‘‘ڈاکٹر مارنو کو جانتے ہو؟’’

‘‘اچھی طرح۔ آپ نہیں جانتے۔ میں تو ان ہی کے یہاں کام کرتا ہوں’’۔

‘‘بہت اچھا’’ یہ کہہ کر باقر میاں نے اُسے اپنی طرف کھینچ کر اپنے قریب بٹھا لیا۔

ٹھیک اس وقت گھنی جھاڑیوں کے اندر مریض یورپین سپاہی طویل القامت عورت کے شانے پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر اور اسکے منہ کے پاس منہ بڑھا کر عشق و محبت کا اظہار کر رہا تھا۔

باقر میاں نے لڑکے کو اچھی طرح دیکھتے ہوئے کہا ‘‘تم بڑے خوش قسمت معلوم ہوتے ہو۔ جلد ہی بڑے آدمی بننے والے ہو۔ دیکھوں تمہارا ہاتھ’’۔

لڑکے نے اس کی طرف اپنا داہنا ہاتھ بڑھا دیا۔

اس کے ہاتھ کی لکیروں کو اچھی طرح دیکھتے ہوئے باقر میاں نے کہا۔" میں نے ٹھیک ہی کہا تھا" اور اس کے بعد ایک اور لکیر کو دیکھ کر اس نے کہا۔" اس لکیر کو دیکھو، جس کے ہاتھ میں یہ لکیر ہوتی ہے وہ بڑا آدمی ضرور بنتا ہے۔"

لڑکے نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔" سچ؟"

"ہاں سچ کہہ رہا ہوں۔ تم یقیناً بڑے آدمی بنو گے۔ نام کیا ہے تمہارا؟"

"خورشید"

" خورشید!" یہ کہہ کر باقر میاں نے اس کے چہرہ کی طرف دیکھا پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

خورشید نے پوچھا۔"کیوں بات کیا ہے، رونے کیوں لگے؟"

باقر میاں نے روتے روتے کہا۔" ٹھیک تمہارا جیسا میرا بھی ایک بھتیجا تھا۔ لیکن ملٹری ٹرک کے نیچے کچل کر وہ دوسری دنیا میں چلا گیا۔ تمہیں دیکھ کر اس کی یاد تازہ ہو گئی۔" باقر میاں خورشید سے لپٹ کر رونے لگا۔

•

اُس دن ڈاکٹر مارنو نے رات کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے کتب خانہ میں" انسان اور دنیا" نامی فلسفہ کی ایک کتاب لکھنا شروع کی۔ ڈاکٹر مارنو

فلسفہ کا ڈاکٹر تھا اور دیس بدیس میں اس کی بڑی شہرت تھی۔ لیکن اتنی شہرت حاصل کرنے میں اس کی عمر کے تیس سال اور گذر چکے تھے۔

"انسان اور دنیا" لکھتے لکھتے ڈاکٹر مارنو کو محسوس ہوا کہ ایک لمحہ کے لئے بھی اُنہیں زندگی کا لطف نہیں ملتا۔

اُسی لمحہ میں ٹیلیفون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ مارنو نے بادلِ ناخواستہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر فون کا رسیور اُٹھایا اور کہا۔ "ہیلو، مارنو اسپیکنگ"

آواز آئی۔ "میں پروفیسر ہُڈی بول رہا ہوں آل انڈیا فلاسفی کانفرنس کے دفتر سے۔ کیا آپ نے صدارتی خطبہ چھپوالیا؟"

"ہاں!"

"تو کل ٹھیک تین بجے ہم آپ کے استقبال کے لئے آرہے ہیں۔"

"بہت خوب"

"اچھا گڈ بائی!"

"گڈ بائی!"

مارنو وہاں سے اُٹھنا ہی چاہتے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بج اُٹھی۔

"ہیلو!"

"میں آل انڈیا کرسچین سوسائٹی سے بول رہا ہوں۔ آئندہ ۲۲ تاریخ کو کانفرنس ہو رہی ہے۔ آپ کو صدارت کرنے کی تکلیف دی جا رہی ہے۔"

کچھ دیر اور باتیں ہونے کے بعد مآرنو اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئے لیکن اسی وقت ایک شخص دروازہ کے قریب آکر بولا "اندر آسکتا ہوں، سر؟"

مآرنو نے کہا "کون ہے؟"

چھاپہ خانہ کا منیجر اندر داخل ہوا۔ اس نے کہا "انڈیا گورنمنٹ سے کنٹراکٹ ملا ہے، اڑھائی کروڑ امپریشن! کافی پیسے بچ جائیں گے لیکن آپ کو ایک بار سکریٹری کے ساتھ گفتگو کے لئے سفر کرنا پڑے گا۔"

مآرنو نے کسی قدر حیرت سے پوچھا — "کب جانا ہوگا!"

"پرسوں اکسپریس سے"

"اچھا" کہہ کر مآرنو اپنے کام میں منہمک ہو گئے۔

منیجر نے پھر کہا — "ایک بات اور ہے۔"

"کہو"

"چھاپہ خانہ کے مزدوروں نے ہڑتال کرنے کی دھمکی دی ہے۔"

"کیوں؟" ڈاکٹر مآرنو نے تعجب سے کہا۔

"پندرہ نکات کا مطالبہ ہے جن میں مزدوری میں اضافہ، مہنگائی بھتہ، چھٹی وغیرہ شامل ہیں۔ حساب کر کے اندازہ ہوا ہے کہ اگر ان کے مطالبے مان لئے جائیں تو منافع سے صرف پانچ فیصد کم کر دینا ہو گا، لیکن میں اڑھائی فیصد کم کرنے کے حق میں ہوں۔"

مارنو نے کہا "جو تمہارے جی میں آئے کرو"۔

مینیجر کچھ اور بک بک کرنے کے بعد چلا گیا۔

لیکن اس کے جانے کے بعد اور بھی کئی لوگ آئے۔

اسی طرح روزانہ مختلف طبقہ خیال کے لوگ ڈاکٹر مارنو کے پاس آتے اور اُن کا کافی وقت برباد کرتے اور جب وہ سارے دن کی تھکن کے بعد کچھ لکھنے بیٹھتے تو اُن کا ذہن کسی ایک نقطہ پر مشکل سے جمتا۔ اس کے باوجود وہ جبر کر کے لکھتے اور لکھتے جاتے۔

اتفاق سے پھر کسی نے دروازے کی دراڑ سے جھانکا اور آواز دی —

"اندر آسکتا ہُوں؟"

"کون؟" مارنو نے جواب میں صرف اتنا کہا۔

"میں ہوں باورچی" یہ کہہ کر ہمارا باقر میاں داخل ہوا۔ خورشید کی سفارش سے وہ چند ماہ کے لئے ڈاکٹر مارنو کے یہاں باورچی کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔

باقر میاں نے قریب آکر بازار کے حساب کی ایک کاپی ڈاکٹر مارنو کے سامنے رکھ دی اور کہا:۔

"آج اکیس روپے پانچ آنے چھ پائی خرچ ہوئے ہیں۔ کل کے لئے حکم ہو"

گھر کی ساری ذمہ داری ڈاکٹر مارنو کی بھانجی روزا کے شانے پر تھی۔ لیکن صحت کی خرابی کی وجہ سے وہ چند ماہ قبل الموڑہ چلی گئی تھی اس لئے ان ساری باتوں کا حساب کتاب بھی ڈاکٹر مارنو ہی رکھنے لگے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ روز بروز ڈاکٹر مارنو کے مزاج میں چڑچڑا پن آتا گیا ــــ کام، کام اور صرف کام! نہ جانے ان باتوں سے اُن کو کب نجات ملے گی کہ وہ علمی کاموں کی طرف دھیان دے سکیں ــــ شاید زندگی اسی طرح گذر جائے گی اور شاید موت ہی اس کا فیصلہ کر دے۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گذرا ہو کہ انہیں اطمینان نصیب رہا ہو ــــ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ گہرے خواب سے چونک کر اُٹھ بیٹھے ہیں ــــ آخر یہ سب کس کے لئے اور یہ ساری دولت کس کام کی؟ ان کا دل ڈوبنے لگا۔ اور فیصلہ کر لیا کہ کل سویرے اُٹھ کر ان سارے جھمیلوں اور بکھیڑوں سے الگ ہو کر ہی تارک الدنیا ہو جاؤں گا لیکن سویرے اُٹھ کر گرہستی اور دنیاداری کی زنجیریں پھر ان کو جکڑ لیتیں اور وہ پھر اُسی محور پر آجاتے۔

مارنو یکایک اُٹھ کھڑے ہوئے اور باقر میاں کی طرف دیکھ کر نہ جانے کس سوچ میں غرق ہو گئے اس کے بعد آہستہ آہستہ بولے:

"سنو باقر"

باقر میاں چونک پڑا اور اس کی زبان سے یہ الفاظ نکل پڑے۔
"آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں باقر میاں نہیں ہوں، میں تو حضور کا باورچی ہوں"

مارنو کو ہنسی آگئی۔ انہوں نے کہا "خوف نہ کھاؤ۔ میں تمہیں بہت پہلے سے پہچان چکا ہوں، تم میری آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتے۔ شاید تمہیں نہیں معلوم کہ میں تمہیں بہت چاہتا ہوں۔ نہ جانے کہاں کہاں میں نے تمہیں ڈھونڈا ہے۔ خیر تم خود آگئے"

باقر میاں خاموش کھڑا رہا۔

مارنو کہتے گئے — "میری بات سنو — ذرا اور قریب آؤ۔ لو میری پوشاک۔ میری جائداد، میرا گھر بار سب تمہارے نام لکھے دیتا ہوں۔ آج سے تم ہی ڈاکٹر مارنو ہو — اور میں آوارہ گرد باقر — آؤ ادھر!"

اور پھر اس اندھیری رات میں باقر کو اپنی جگہ سونپ کر ڈاکٹر مارنو نہ جانے کہاں غائب ہو گئے — اور تب سے باقر میاں ڈاکٹر مارنو بن گئے اور ڈاکٹر مارنو نے باقر میاں کی زندگی اختیار کر لی۔

اس کے بعد سات سال گذر گئے۔ اس عرصہ میں بڑے بڑے

انقلابات آئے ـــــ اور ایک دن سچ مچ انقلاب کا پہیہ پورا گھوم گیا اور ڈاکٹر مارنو واپس آگئے۔

برسات کا موسم تھا۔

اندھیری رات تھی اور بادل ٹوٹ کر برس رہے تھے، ہوا بھی طوفانی چل رہی تھی۔

روزا پیانو بجا رہی تھی اور باقر میاں تنہا نہ جانے کس خیال میں کھویا ہوا تھا۔

اس سات سال کے عرصہ میں اس کا چہرہ بھی بدل گیا تھا۔ سر کے بہت سارے بال سفید ہو چکے تھے اور چہرہ میں زردی بھی آگئی تھی۔ اس سات سال کے عرصہ میں اُس نے نقلی ڈاکٹر مارنو کا پارٹ بڑی خوبی سے ادا کیا تھا۔ بڑی بڑی محفلوں میں جاکر اُس نے سکریٹری کی لکھی ہوئی تقریر پڑھی تھی۔ چھاپہ خانہ کو تو اُس نے کافی ترقی دی، لیکن اس کے عوض میں اُس کو کیا ملا؟

صحت بگڑ گئی اور زندگی وبال ہو چکی تھی!

روزا کے پیانو کے سُر جیسے آج نڈھال ہو گئے تھے ـــــ اس وقت پھٹی ہوئی قمیص اور میلے کچیلے پینٹ میں ایک شخص مکان کے اندر گھس گیا۔ روزا کی چیخ نکل گئی اور گرج کر بولی: "کون؟ کون ہو تم؟

نکل جاؤ۔"

نقلی مارنو نے صوفہ سے اُٹھ کر کہا۔" کیا چاہتے ہو تم، نکل جاؤ۔ فوراً، اسی وقت۔"

نو وارد نے نحیف لہجہ میں کہا۔" چھ دنوں سے کچھ کھایا پیا نہیں ہے، سُوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا ہی دے دو۔"

روزا دروازہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی:" نکل جاؤ، نکل جاؤ"

نو وارد نے کربناک آواز میں کہا۔" روزا کیا تم بھول گئیں مجھے، میں ہوں تمہارا ماموں جان ڈاکٹر مارنو ...... اور وہ جو سامنے بیٹھا ہوا ہے ......"

روزا نے گرج کر پھر کہا۔" خاموش، دور ہو جاؤ یہاں سے۔"

باقر میاں یعنی نقلی ڈاکٹر مارنو نے کہا۔" روزا خاموش رہو، نہیں پہچانتیں اُسے۔ وہ باقر میاں ہے، جو کبھی چھاپہ خانہ کا اسٹورکیپر رہ چُکا ہے، جس نے سونے کی گھڑی چُرائی تھی، کیا حالت ہو گئی ہے اس کی! اس کے بعد اس نے نو وارد سے مخاطب ہو کر کہنا شروع کیا۔" سنو باقر میاں، شاید آج تم نے زیادہ شراب چڑھا لی ہے۔ اچھا چلو میں نیچے تک پہنچا دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ نو وارد کے ساتھ نیچے چلا گیا۔

نوواردنے کہا۔" باقر، سات سال تک صحرانوادی کرتا رہا ہوں، سوچتا تھا زندگی کے جھمیلوں سے نجات مل جائے گی مگر یہ تو کوئی آزادی نہیں ہے ......"

"سمجھ گیا۔ بھوک، افلاس اور تکلیف تمہیں پھر یہاں کھینچ کر لے آئی۔ سوچتا تھا کہ تم مجھ سے زیادہ بہادر ہو، بڑے ہو مگر ....."

نووارد خاموش رہا!

باقر میاں نے کہا۔" اچھا ڈاکٹر مارنو سنو، تمہاری زندگی حاصل کر کے مجھے بھی خوشی نہیں ملی۔ لو اپنی پوشاک، دھن دولت۔ سب کچھ واپس کر رہا ہوں اور مجھے میری پھٹی پرانی قمیص اور میلا کچیلا پینٹ دیدو۔"

نیچے سیڑھی کے پاس اندھیرے میں دونوں نے لباس تبدیل کیے، اور پھر اسی برق وباد میں باقر میاں نکل پڑا۔

اور ڈاکٹر مارنو زینہ طے کر کے اوپر آئے۔ انہوں نے کہا۔" روزا، رات بھیگ چکی ہے، اب سو جاؤ اور ہاں سنو جب بھی باقر میاں سے ملاقات ہو جائے اُس سے کہہ دینا کہ ڈاکٹر مارنو تم سے معافی کا طلبگار ہے۔"

سیّد ولی اللہ
ترجمہ: یونس احمر

کٹا ہُوا چاند

شیخ جبّار کو دھن دولت کا مالک نہ کہا جائے تو عجیب سی بات ہوگی۔ اُس کے دو گاڑیاں، دو گھوڑے، آٹھ عدد نوکر چاکر اور "حرم سرا" کے اندر ایک نہیں پوری چار عدد بیویاں تھیں۔ آمدنی و خرچ ہی اگر دولت مند ہونے کی علامت ہے تو شیخ جبّار اس میں پورا اترتا تھا۔ آمدنی کے ذرائع میں اس کے دو گھوڑے گاڑیاں اور خرچ کے حصّے میں چار عدد بیویاں تھیں۔

شیخ جبّار کا مکان جس محلّے میں تھا وہاں صرف کوچوان اور گھوڑے رہتے تھے۔ گھوڑوں کے رہنے کے لئے وسیع علاقے میں اصطبل بنا ہوا تھا اور اصطبل کے اردگرد کئی عدد چائے کی دکانیں اور ہوٹل تھے ــــــ

اور پھر دوسری طرف بستیاں تھیں اور ان بستیوں کے سب سے آخری حصہ میں شیخ جبّار کا مکان تھا۔

اس وقت رات کے دو ضرور بج چکے تھے مگر بستی والوں کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ چاروں طرف شور ہنگامہ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ جا بجا مختلف قسم کی محفلیں جمی ہوئی تھیں۔ کوئی پکّے گانے گا کر فن استادی کا مظاہرہ کر رہا تھا، کہیں سستے قسم کے لطیفوں اور چٹکلوں سے قہقہے بلند ہو رہے تھے اور کہیں بہت سارے لوگ تاش کھیلنے میں محو تھے۔ لیکن لوگوں کی سب سے زیادہ بھیڑ تھی، شیخ جبار کے مکان کے پاس۔

ابھی وہاں ایک پُرانے سے گراموفون پر کسی بائی جی کا ریکارڈ بج رہا تھا۔ گراموفون کو بڑی مشکل سے ایک پاشکستہ تین ٹانگوں والی میز پر رکھا گیا تھا ــــ اوپر لکڑی کی شہتیر کے سہارے لالٹین جھول رہی تھی اور اسی کی روشنی میں گراموفون سے ذرا پرے ایک لڑکا جو روزانہ گھوڑوں کو گھاس کھلانے کا فرض انجام دیا کرتا۔ پاؤں میں گھنگھرو ڈال کر ناچ رہا تھا اور وہاں جتنے تماش بیں موجود تھے سب مست ہو کر غیر مہذب الفاظ استعمال کر رہے تھے۔ ریکارڈ ختم ہوا مگر ناچ بدستور جاری رہا۔ شیخ جبار کو اس سے بڑی لذت مل رہی تھی۔ اُس نے پھر دوسرا ریکارڈ لگایا اور بائی جی کی آواز پھر فضا کو

مسحور کرنے لگی۔

اس بستی میں یہ جشن اس لئے منایا جارہا تھا کہ آج شیخ جبّار کے حرم میں چوتھی بیوی داخل ہورہی تھی ـــــ جبّار نے آج سبھوں کو دعوت دی تھی۔ بیاہ دو سال پہلے ہوچکا تھا مگر بیوی کم سن تھی اس لئے وہ اتنے دن میکے میں پڑی رہی۔

آج جبّار کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا ـــــ آج تو تمام مہمانوں کو اُس نے بریانی کی دعوت دی تھی، اور ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے اُس کی خوشی کا اُجالا چاروں طرف پھیل گیا۔ اُس نے آج خاص قسم کا لباس بھی پہن رکھا تھا ـــــ لال رنگ کی بھڑکیلی برمی لُنگی، مرشد آبادی ریشم کا سفید کُرتا اور کُرتے کی اوپر والی جیب میں پھول کڑھا ہوا خوبصورت سارومال ـــــ دیسی عطر میں بسا ہوا۔ سر کے بال تیل ڈال کر بڑی عمدگی سے بنائے گئے تھے۔ پاؤں میں چِنیا بازار کا خریدا ہوا چمکدار پمپ شو تھا۔ شیخ جبّار کا چہرہ ذرا بڑا تھا، آنکھیں بھی بڑی اور سُرخ اور تھوڑی سی چھوٹی داڑھی تھی۔

چھوکرے کے ناچ سے پوری بستی لطف اندوز ہورہی تھی اور بائی جی کے گانے سُن کر لوگ بھی جھوم رہے تھے۔ لیکن شیخ جبّار کے ہونٹوں پر صرف ہلکا ہلکا تبسّم تھا۔ کچھ دیر کے بعد جبّار کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی،

اُس نے کہا ــــــ

"واہ واہ، سُبحان اللہ۔ بھئی جمال کیا کہنا، ایسا ناچ کبھی تم نے دیکھا ہے، ماشاء اللہ۔"

لیکن شیخ جبّار کا جگری دوست جمال میاں ایک طرف اندھیرے میں گٹھری بنا پڑا ہوا تھا۔ کئی مٹکے چڑھا لئے تھے اُس نے!

•

ادھر حرم سرا کے اندر تینوں بیویوں کے منہ میں تین قسم کی باتیں تھیں۔ نئی نویلی بیوی کی عمر بہت کم تھی ــــــ یہی کوئی بارہ سال ہوگی۔ چھوٹا چہرہ اور نحیف سا جسم۔ اُسے دیکھ کر واقعی شک ہوتا تھا کہ اس کے بھاری زیورات کے نیچے کوئی جسم ہے بھی یا نہیں۔ ناک میں نتھ، جُھمکے، ہاتھوں میں بہت سی چوڑیاں، پازیب، بچھوے وغیرہ ــــــ غرض وہ زیور میں بالکل بھری ہوئی تھی۔ چھ عدد گھوڑوں اور چھ سائیسوں نے مل کر جو کمائی کی تھی اُس میں سے تین حصّہ یقیناً اس لڑکی کے زیورات پر خرچ کر ڈالا گیا تھا۔

لڑکی کے ہونٹوں پر نہ کوئی طمع تھی نہ لالچ اور نہ آنکھوں میں کوئی تھکن ــــــ البتہ وہ گھر کے چاروں طرف آنکھیں گھما گھما کر کچھ مشاہدہ کر رہی تھی۔ کبھی وہ بڑی کو دیکھتی، کبھی اُس کی آنکھیں منجھلی پر

پڑجاتیں اور کبھی سنبھلی پر، غرض وہ عجیب مخمصے میں مبتلا ہو گئی تھی۔ بیچاری کی زبان تو بالکل بند تھی، وہ کہتی بھی کیا، گفتگو کا آغاز کیسے کرتی۔

اسے دیکھ کر پہلی تین بیویاں بڑی باتیں بنانے لگیں، ہر کسی بات پر صلواتیں سُنا دیتیں اور یہ بے چاری ہضم کر جاتی۔ اس کے ارد گرد تینوں بیویاں بیٹھ گئیں۔ اس کے حسن و جمال پر تینوں کے دل میں حسد کے شعلے سُلگ اُٹھے تھے۔ بہت دیر تک تینوں اس کو نہایت ہی خاموشی کے ساتھ گھورنے میں مصروف رہیں۔ لیکن جب سینہ پر ڈاہ کے سانپ لوٹنے لگے تو ایک نے اس طرح طنز کیا۔۔۔

"اتنے دنوں تک شوہر سے الگ رہنے پر تجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی؟"

اس نے بڑی معصومی سے اُس کی طرف دیکھا اور خاموش رہی۔ اس کی بجائے دوسری بیوی نے جواب دیا۔۔۔ "بیتی باتیں یاد دلا کر اُسے پریشان نہ کرو۔۔۔ کتنی مشکل سے سُکھ کے دن آتے ہیں۔"

کچھ دیر بعد تیسری بیوی نے اُس سے دھکا دیتے ہوئے پوچھا۔۔۔ "نئی دلہن ذرا مُنہ تو کھولو؟"

"کیوں، دانت دیکھنا چاہتی ہو؟"

"نہیں زبان!"

اور پھر اس کے بعد قہقہوں کی پھوار پڑنے لگی۔ اخیر میں پہلی بیوی نے کہا۔ "بھئی سچ کہتی ہو، یہ تو بالکل گونگی معلوم ہوتی ہے — ہاں بھئی منہ تو کھولو۔"

لیکن اس کے ہونٹ بدستور بند رہے، صرف آنکھوں کی پتلیاں گھوم رہی تھیں۔

پہلی بیوی کی ذراہٹ بڑھی، اُس نے تنکھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "شاید نئی دلہن کو خوف محسوس ہو رہا ہے — کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"ارے بھئی زبان تو کھولو، خاموشی کا قفل کب تک چڑھا رہیگا منہ میں۔" دوسری بیوی نے گرج کر کہا :

"ہاں بھئی بیگم صاحبہ، ملکہ معظمہ۔"

"گھوڑوں کے بادشاہ ہیں تیرے وہ، اسے نہ بھولنا۔"

"ہاں ہاں ذرا ادب سے بات کرنا، وہ گھوڑوں کے بادشاہ ہیں اور تم ان کی پیاری بیگم — کیوں کیا خیال ہے گل بہن؟"

اور گل کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

●

باہر مسرت کا آتش فشاں روشن تھا اور یہاں نفرت وعداوت

کی چنگاریاں پھُٹ رہی تھیں۔ نفرت و عداوت ہی تو ان کا مذہب تھا۔ ان ہی کے سہارے وہ زندہ تھیں، ان کے جسم کو سورج کی کرنیں کبھی چھُو نہ سکیں۔ تینوں کے ہونٹوں پر تلخ ہنسی تھی اور اس ہنسی کے نیچے ان کی نفرت پرورش پاتی تھی۔

پہلی بیوی نے آہستہ آہستہ کہا۔ "واہ کتنی خوبصورت ہے، جیسے آسمانی تارہ"۔

"ہاں بہن، بالکل فردوس بریں کی حور"۔

دوسری نے اس کو پھر دھکّا دیا۔ "بھئی پریشان نہ کرو اسے۔ ہاں ذرا بات چیت تو کرلو۔ گھوڑوں کے بادشاہ نے تو خوب پسند کیا ہوگا تم کو"۔

تیسری بولی۔ "ہاں بہن گھوڑوں کے بادشاہ کے لئے اس کا دل بہت بے چین معلوم ہوتا ہے"۔

بے چاری نویلی دلہن بالکل خاموش تھی اور تینوں نے اُسے رُلانے کا تہیہ کر لیا تھا ــــ لیکن آخر کب تک برداشت کرتی۔ اس کی آنکھوں میں چنگاریاں پیدا ہونے لگیں اور لب کپکپانے لگے۔ وہ غصّہ سے دیوانی ہوگئی اور بپھر کر تیسری بیوی کے جسم میں چوہے کی طرح دانت گاڑ دئے۔

اب کیا تھا تینوں آگ بگولہ ہوگئیں اور تینوں مل کر اُس کے کمزور جسم پر پل پڑیں کسی نے اُس کے سر کے بال نوچے، کسی نے گھونسے مارے، کسی نے گالیاں دیں۔

•

آسمان کے اوپر رات کا گہرا سکوت طاری تھا، وہاں زمین کے ہنگاموں اور ہنگامہ آرائیوں کا گزر نہیں۔ وہاں کی دُنیا زمین کی دنیا سے بالکل مختلف ہے۔ وہاں نہ طوفان کے جھکڑ ہیں، نہ آندھیوں کے بگولے۔ وہاں ایک عمیق سنّاٹا ہے۔ لیکن یہ دنیا ——— ہنگامہ و فساد، چھل کپٹ، نفرت و عداوت، مار دھاڑ اور کینہ و بُغض کی جگہ ہے۔ اسی لئے تو یہاں لوہے کی زنجیریں درکار ہیں۔ یہاں کے لوگوں کو آزادی پسند نہیں۔

باہر مردانے میں اب تک وہی طوفان مچا ہوا تھا۔ چھوکرا مسلسل ناچ رہا تھا اور تالیاں بج رہی تھیں۔ بہتوں کی آنکھیں اونگھنے لگی تھیں، لیکن واہ واہ کی فلک شگاف آوازوں اور گھنگھروؤں کی مترنّم صداؤں سے ان کی غنودگی دور ہو جاتی اور پھر ان کے جذبات مرتعش ہو جاتے اور ان کو ایسا محسوس ہوتا جیسے ان کے پیاسے دلوں کے اندر کوئی نازک اندام لڑکی اشارے کر رہی ہے۔

وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ رات کسی طرح ختم ہو ـــــ کیا شیخ جبّار کی آنکھوں میں بھی نشہ گھر کر گیا تھا؟ ممکن ہے اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں اندھیرا گہرا ہو چکا ہو ـــــ ایسا اندھیرا جس کی پرچھائیں میں درد و کرب کو بھی تبسم کی لہروں میں بہا دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد سب کے سب عالمِ بیہوشی میں آہستہ آہستہ محل سرا کی طرف جانے لگے۔ سب کے پیچھے گراموفون والا تھا۔ وہ بھی نشہ میں عورت کی آواز کی نقل اتار کر گانا گانے لگا ـــــ شیخ جبّار چاہتا تھا کہ آج کی رات گانے ختم نہ ہوں۔ اُسے ان گانوں میں عجیب لذت مل رہی تھی۔ اصطبل میں گھوڑے ہنہنا رہے تھے مگر اُسے کچھ خبر نہ تھی۔ وہ تو اپنی دنیا میں مگن تھا۔ اصل میں وہ تو آج جی بھر کے ساری مسرتیں نچوڑ کر پی جانا چاہتا تھا۔ کوئی دم توڑ رہا ہو تو اُس کی بلا سے، کسی کو کھانا نہیں مل رہا ہے اس کو کیا غرض، کوئی بھوک سے تڑپ رہا ہے تو تڑپا کرے ـــــ اس وقت تو گھنگھروؤں کی سُریلی آوازیں دل کو لبھا رہی تھیں، اس وقت تو جلوۂ رُخِ یار پُتلیوں میں رقص کر رہا تھا۔

محل سرا کے اندر داخل ہونے سے پہلے شیخ جبّار عالمِ غنودگی میں دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گیا اور جمّال کے ساکت و جامد جسم کو رگڑتے ہوئے کہا ـــــ "ارے بھئی جمّال میاں جانتے ہو دنیا داری کیا چیز ہے؟"

جمال میاں کے نتھنے پھڑکنے لگے اور پھر بڑی مشکل سے اُس نے شیخ جبّار کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے جواب دیا۔ "ارے او بیوی کی گائے ___"

یکایک اس کے جسم کو پھریری سی ہوئی اور اس نے آنکھوں کو ملتے ہوئے کہا۔ "لاحول ولا، میرے مُنہ پر گھوڑے کی لید، ارے بھئی یہ تو بیوی نہیں ___ یہ تو بیوی کا باپ ہے۔"

دوسری طرف جہاں آتش بازی چل رہی تھی یکایک وہاں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ مگر شیخ جبّار کو اس سے کیا مطلب۔ اس کی آنکھوں میں تو آج مسرتوں کی قندیلیں روشن تھیں۔ آج دنگا ہو یا فساد، آج اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے، آج قیامت برپا ہو جائے مگر شیخ جبّار اپنے عیش کو خراب نہیں کرے گا۔ اُسے دنیا کا کوئی خوف نہیں، کوئی ڈر نہیں۔ اس مٹی کی دھرتی کے چہرہ پر گھوڑے چارسو دولتیاں کیوں نہ لگا دیں مگر وہ دل کھول کر قہقہے لگائے گی، اُسے طیش نہیں آئے گا۔

ان ہنگامہ آرائیوں کے بعد یکایک خاموشی چھا گئی محل سرا کے اندر بھی گہرا سکوت تھا اور وہ سکوت نئی نویلی دلہن کی بے جان اور گونگی زندگی کا آئینہ تھا۔

نئی نویلی دلہن کی آمد پر خوشی کی جو لہریں دوڑ گئی تھیں اُس

خوشی کا ایک حصّہ بھی اُسے نہیں ملا۔ اُس کے دل کے اندر تو ایک آتش فشاں دہک رہا تھا۔ اُس کے زیورات کے تار کھینچا تانی میں ٹوٹ گئے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے جو آنکھیں گھڑی کی سوئی کی طرح پیہم گھوم رہی تھیں اب وہ بند ہو چکی تھیں۔ اس کا جسم نفرت کی آگ سے جُھلس چکا تھا۔

پہلی بیوی روکر کہنے لگی " خدایا، نہ جانے میری بیٹی کا کیا حال ہو؟"

بارہ چودہ سال پہلے کی بات ہے ــــ جب پہلی بیوی کے بیٹی پیدا ہوئی تھی ــــ اب اس کا وجود نہیں ہے، صرف اس کے حافظے میں اس کی یادیں رہ گئی تھیں ــــ کیا اس کے ہونٹ بھی نئی نویلی دلہن کی طرح تھے ــــ اور یہ ٹھوڑی یہ پیشانی، سب چیزیں وہی تھیں ــــ یکایک طوفانی ہوا کے جھکّڑ چلنا شروع ہو گئے ــــ پہلی بیوی کے رُونگٹے کھڑے ہو گئے، اُس کا جسم کانپنے لگا، مامتا پھڑکنے لگی۔

"یا خدا تو نے کیا کیا . . . . ."

باہر گراموفون ریکارڈ بج رہا تھا لیکن گھنگھرو کی آواز دھیمی پڑ گئی تھی۔ ہنگامے پھر شروع ہو چکے تھے۔ غنی میاں بھی ریکارڈ کے سُر سے سُر ملا کر محبت کا گیت گانے لگا۔

محل سرا کے اندر گہری خاموشی طاری تھی۔ لیکن گھوڑوں کے

بادشاہ جبّار میاں نے سکوت کی زنجیر کو توڑ ڈالا ــــ وہ ممیا رہا تھا۔ آواز سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ آواز باہر تک پہنچ گئی لیکن اس ہنگامہ آرائی میں اس طرف کسی نے دھیان نہیں دیا۔

فیضؔ میاں نے نہ جانے کس زمانہ میں ایک تھیٹر دیکھا تھا، اُسی کی ایک بات اس کے ذہن میں تازہ ہو گئی۔ وہ شراب کے نشہ میں چُور تھا۔ اُس کے رُوئیں رُوئیں میں شراب کے قطرے پہنچ گئے تھے۔ اُس نے یکایک چیخنا شروع کیا ــــ "شمشیر، بھائیو ہاتھوں میں شمشیر لے کر کھڑے ہو جاؤ۔"

شاید آسمان میں انگور کے خوشے لٹک رہے تھے اور ان خوشوں میں محبت کا رس تھا۔ آخر اتنے سارے انگور کیوں ــــ اتنے خوشے کس لیۓ! اور یہ سارے خوشے عورت کے جسم پر گرنے کے لیۓ جھول رہے تھے۔

آسمان کی طرف اندھیرا چھایا تھا اور بستی کے عوام اپنی ہنگامہ آرائیوں میں مست و بیخود تھے۔ جیسے انسان کا دل سفید مچھلی کی طرح تڑپ رہا ہو ــــ اور ان ہی ہنگامہ آرائیوں کو چیر کر ایک آواز سُنائی دے گئی ــــ "شمشیر برہنہ لے کر کھڑے ہو جاؤ۔"

مگر آسمان پر تو صرف کٹا ہوا ایک چاند نظر آیا، تلوار تو نہیں تھی —
اوپر آسمان کی چھاتی پر انگور کے خوشے لٹک رہے تھے —— اور ہمیشہ
اسی طرح لٹکتے رہیں گے —— اُس کٹے ہوئے چاند کی طرح ⁂

سکندر ابو جعفر
ترجمہ: حبیب انصاری

اصول کی خاطر

مومن کا مقدمہ عدالت سے خارج ہو گیا۔ اس ناکامی میں خود اس کے گواہوں کا ہاتھ تھا۔ انہوں نے زمیندار سے رشوت لے کر سارا معاملہ چوپٹ کر دیا تھا۔

صمد صاحب نے سر پیٹ لیا۔ انہوں نے اس مقدمے پر پیسے بہت خرچ کئے تھے، وہ خود اس مقدمے میں فریق نہیں تھے۔ صرف مومن کی

ہمدردی میں مقدمے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ زمیندار نے مومن کی بیوی کو اغوا کر کے بے آبرو کیا تھا۔ وہ روتا ہوا صمد صاحب کے پاس آیا۔ فریاد کرنے لگا اور صمد صاحب اس کی مدد پر مجبور ہو گئے۔

صمد صاحب کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی مظلوم کی حمایت ان کے لئے ہر چیز سے زیادہ ضروری تھی۔ ۳۰ سال سے وہ اسی طریقے پر چل رہے تھے۔ ان کو کبھی سکون نہیں ملا۔ ان کے پاس بہت بڑی جائداد تھی۔ نقد روپیہ بھی تھا۔ لیکن یہ ساری دولت انہوں نے انصاف اور سچائی کی خاطر قربان کر دی تھی۔ ان کو اس نقصان کا ذرا سا بھی غم نہ ہوتا اگر لوگ احسان فراموشی نہ کرتے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اُن کی دولت بھی ختم ہوتی گئی۔ لیکن مدد چاہنے والوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ ایک نہ ایک سر پر سوار ہی رہتا اور وہ ان تلخ تجربات کے بعد بھی اس کی مدد کرتے تھے۔

کچھ دنوں کے بعد مومن کی بیوی اُسے واپس مل گئی۔ اور شاید کچھ روپے بھی۔ علی اصغر صاحب کی زمینداری میں چند ٹکے، غریبوں کی عزت کی زائد سے زائد قیمت تھے۔ یہ قیمت بھی شاید انہیں نہیں ملتی۔ اگر صمد صاحب کی مخالفت کا ڈر نہ ہوتا۔ زمیندار بھی ہر وقت صمد صاحب سے چوکنا رہتا تھا۔ کاشتکاروں کو صمد صاحب کے اثر سے

بچانے اور اپنا بھرم قائم رکھنے کے لئے اس کو بڑے بڑے جتن کرنا پڑتے تھے۔ وہ ہر دم ان کو دبانے کی فکر میں لگا رہتا تھا۔ کاشتکار بھی علی اصغر صاحب سے کچھ کم نہیں تھے لیکن ان کی چوں چرا سے ہوتا ہی کیا ہے۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ کبھی پلک جھپکتے برہم ہو گئے اور پھر فوراً ہی ٹھنڈے پڑ گئے۔ اس لئے علی اصغر پر ان ہتھکنڈوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو صرف اسی شخص سے ڈرتا تھا جو ہمیشہ ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز بلند کیا کرتا تھا۔

زمیندار کا یہ ڈر اب اور بھی بڑھ گیا صمد صاحب کا اکلوتا بیٹا یونیورسٹی کی سب سے بڑی ڈگری لے کر گھر واپس آگیا تھا۔ شاید وہ بھی کچھ دنوں کے لئے یہاں ٹک جائے اور صمد صاحب کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹائے۔ لیکن خود صمد صاحب کو اس کے طور طریق پسند نہیں تھے۔ وہ شہری زندگی سے پیدا ہونے والے لاابالی پن کو ناپسند کرتے تھے۔ شمشیر تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا۔ اور پھر اتنے دنوں کے بعد اکلوتے لڑکے کی واپسی ہی خوشی کی بات تھی لیکن صمد صاحب کو اس کے چہرے پر اصول اور مقصد کے لئے جد وجہد کی جھلک نہ پا کر بہت مایوسی ہوئی۔ اس کی خصوصیات آرام طلبی اور لامتناہی عیش و عشرت تھی اس لئے شمشیر کی موجودگی کے سبب جو تھوڑی سی خوشی بھی

انہیں ہوئی تھی وہ خود بخود ختم ہوتی گئی۔ لیکن انہوں نے شمشیر سے کچھ نہ کہا اس لئے کہ بُرا کہنا ان کی عادت میں داخل نہیں تھا۔

شمشیر گاؤں کے چند روزہ قیام سے دل برداشتہ ہو گیا۔ اس کی طبیعت ہنگامہ پسند تھی اور یہاں بالکل سناٹا تھا۔ کوئی سرگرمی اور گہما گہمی نہیں۔ گاؤں میں اس کی دلچسپیوں کے لئے کوئی میدان نہ تھا۔ سو سو کر کب تک دن کاٹے جا سکتے ہیں۔ کوئی رنگین فضاؤں میں پرواز کو بھول سکتا ہے، لیکن نرم سینے پر آرام کی نیند سوئے بغیر کیسے زندگی گزار سکتا ہے؟ ایسے ہیجان انگیز لمحوں کے بغیر زندگی شمشیر کے لئے بے معنی تھی۔

شمشیر کا دل اُچاٹ ہو چکا تھا۔ اس نے آس پاس کے علاقوں میں شکار سے وقت گزاری کا فیصلہ کر لیا۔ رائفل اُٹھائی، اور چل کھڑا ہوا۔ شاید اسی بہانے کوئی ہیجان انگیز واقعہ پیش آجائے بہت گھوما پھرا لیکن کوئی شکار ہاتھ نہ آیا۔ مایوس ہو کر لوٹ رہا تھا، سڑک علی اصغر صاحب کے مکان کے پاس سے گزرتی تھی شمشیر چلتے چلتے رُک گیا۔ زمیندار کے بوسیدہ دو منزلہ مکان کو اس نے کئی بار دیکھا تھا۔ مدتوں سے اس زمیندار اور اس کے باپ سے کھٹ پٹ تھی لیکن اس لڑائی سے حاصل؟ دونوں فریقوں نے اس جھگڑے میں کتنا وقت

ضائع کیا ـــــ وہ ان ہی خیالوں میں گم تھا کہ اُس نے کئی ہریلوں کے ایک ساتھ بولنے کی آواز سنی۔ سوچنے کا توازن ختم ہو گیا۔ اب اس کی ساری توجہ ہریلوں کی طرف تھی۔ آوازیں برابر آرہی تھیں۔ ہریل اصغر صاحب کے مکان کی چہار دیواری میں ایک آم کے درخت پر بیٹھے تھے۔ وہ آگے بڑھا اور چہار دیواری کے قریب آگیا۔ اب ہریل صاف نظر آرہے تھے لیکن ان کو مارنے سے فائدہ؟ اگر شکار بھی کر لیا تو وہ گریں گے چہار دیواری کے اندر جہاں سے وہ انہیں لا نہیں سکتا۔ شمشیر اسی کشمکش و پنج میں تھا کہ اس نے فیر کی آواز سُنی۔ دو تین ہریل ڈھیر ہو گئے۔ وہ حیران تھا کہ اس کے شکار پر کس نے ہاتھ صاف کر دیا۔ دیکھتا کیا ہے کہ زمیندار کے مکان میں دوسری منزل کے برآمدے میں ایک لڑکی کھڑی ہے۔ اور اس کی بندوق کی نالی سے دھنواں نکل رہا ہے۔ شمشیر کو یہ لڑکی بہت اچھی معلوم ہوئی۔ ٹکٹکی باندھ کر اُسے دیکھنے لگا۔ لڑکی واقعی خوبصورت تھی۔ اس نے پرانے تجربوں کو یاد کرنا شروع کیا۔ اس نے ایسا حسین چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ ـــــ شمشیر بحالِ خراب گھر واپس آگیا۔ ایک شخص یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا۔ شمشیر کی فریفتگی کا حال اس پر روشن ہو گیا۔ یہ زمیندار علی اصغر صاحب کا پُرانا منیجر تھا۔ پوری زمینداری پر اسی کا اقتدار

تھا۔ حد سے زیادہ چالاک، زمینداری پر بُرے دن آ چکے تھے جس سے اس نے بھی خوب فائدہ اٹھایا، لیکن چالاکی اور عیاری سے بہتی گنگا میں ہاتھ بھی دھوئے اور زمیندار کے سامنے سرخرو بھی رہا۔

مینجر اس ساری واردات کا تماشائی تھا۔ شمشیر کے چلے جانے پر اس نے سارا قصّہ علی اصغر صاحب سے دُہرایا۔ اصغر صاحب آپے سے باہر ہو گئے۔ اُن کو مینجر پر بھی غصّہ آیا ــــ "آخر اُس کی ہمّت کیسے پڑی کہ وہ میری لڑکی کو بے شرم بندر کی طرح گھورے، تم نے اُسے تھانے کیوں نہیں بھیج دیا؟ یہ زیادہ اچھا ہوتا کہ انیسہ اُسے گولی کا نشانہ بنا دیتی ــــ"

مینجر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "انیسہ نے اسے شکار تو کر ہی لیا۔ لڑکی کیا ہے جنّت کی حور ہے۔ اس کو دیکھ کر حواس قابو میں رکھنا معمولی باپ کے بیٹے کا کام نہیں۔ اب ایک چال میں بازی آپ کی ہے۔"

اصغر صاحب اپنے مینجر کے اِن اشاروں کو نہ سمجھ سکے انہوں نے کہا "بعض وقت تو آپ ایسی لمبی باتیں کرتے ہیں کہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

مینجر نے سادگی سے کہا ـــ "اب صاف صاف سُنئے۔ اگر آپ کو اس گاؤں میں رہنا ہے تو زمینداری کے ساتھ رہنا ہوگا، مگر زمینداری کا جو حال ہے وہ ظاہر ہے۔ اگر ایسے دو چار صدمے پہنچے تو پھر آپ کو

ہمیشہ کے لئے یہاں سے چلا جانا پڑے گا۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ صمد صاحب سے صلح کر لیجئے۔ اگر یہ زہریلا پودا جڑ سے اکھڑ بھی گیا تو آپ کو تو اپنی جگہ سے ضرور ہلا دے گا۔ ذلت کے بغیر صمد صاحب سے مصالحت کا ذریعہ صرف شمشیر ہے۔ لڑکا بُرا نہیں ہے۔ خاندانی دولت میں بھی آپ سے کم نہیں ہے۔ کمی ہے تو صرف اتنی کہ ان کے پاس زمینداری نہیں ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ لڑکے کی اُٹھان بتا رہی ہے کہ وہ دس سال میں ایسی تین زمینداریاں بنا سکتا ہے۔ میرا کہنا مانیئے تو انیسہ کی شادی شمشیر سے کر دیجئے۔ لڑکی کو دیکھنے کے بعد اس کے دل کی بیقراری کا حال اس کا چہرہ بتا رہا تھا۔"

اصغر صاحب نے اپنے مینجر کی اس تجویز کو سُنا۔ زبان سے کچھ نہ نکالا۔ پھر خود ہی تھوڑی دیر بعد بولے "لیکن یہ تجویز ــــــ صمد صاحب کے پاس کون لے جائے گا؟" ــــــ "آدھا کام تو خود انیسہ نے کر لیا۔ باقی کام میں انجام دوں گا۔ شمشیر خود ہی باپ سے کہے گا۔ اس وقت تو آپ کی رضامندی کی ضرورت ہے۔" مینجر نے جواب دیا۔

اصغر صاحب بہت دیر تک سوچتے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دیں۔

اصغر صاحب بہت دیر تک سوچتے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دیں۔ مینجر نے پھر کہا ــــ "حکومت کے زراعتی قرضے

کی ۲۵ ہزار روپے کی رقم میں خورد بُرد کا مقدمہ ابھی چل ہی رہا ہے۔ آپ کے مستقبل کا انحصار مقدمے کے فیصلے پر ہے۔ جو حالت ہے وہ آپ سے چھپی نہیں ہے۔ یہ روپیہ کاشتکاروں کے لئے آیا تھا، ان کو ایک پیسہ نہیں ملا۔ یہ عدالت میں ثابت کیا جائے گا۔ یہ صمد صاحب کا آخری اور بھرپور وار ہوگا۔ اگر آپ اس سے بچنا چاہتے ہیں تو صمد صاحب کی دوستی ضروری ہے"

علی اصغر صاحب کچھ جواب دیئے بغیر اُٹھ کر چلے گئے۔ مینیجر نے اپنے آقا کی خاموشی کو رضامندی خیال کیا اور دل ہی دل میں خوش ہونے لگا۔

•

شمشیر اور مینیجر کی خفیہ ملاقاتیں ہوئیں۔

•

اور کچھ دنوں کے بعد صمد صاحب کو پتا چلا کہ شمشیر علی اصغر صاحب کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور وہ بھی اس پر رضامند ہیں۔

صمد صاحب پہلے تو خوش ہوئے۔ ان کا لڑکا زمیندار کا داماد بنے گا۔ لڑکے کا گھر بسے گا۔ ان کو زمیندار سے پرخاش تھی لیکن اس وقت وہ سب بھول گئے۔ انہوں نے مینیجر کو بُلا بھیجا۔

مینیجر سے انہوں نے کھل کر بات کی اور کہا مجھے شمشیر کی شادی

ہیں کوئی عذر نہیں ہے۔ لڑکا اپنی پسند سے بیاہ کر رہا ہے یہ میرے لئے خوشی کی بات ہے لیکن ایک شرط ہے۔ یہ شادی اُس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک زراعتی قرضے کے مقدمے کا فیصلہ نہ ہو جائے۔ میں عدالت میں اپنا بیان ضرور دوں گا۔ اور کھُل کر بیان کروں گا۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔ جائیے اور اصغر صاحب سے کہہ دیجئے۔" مینجر کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اس نے دل پر جبر کر کے سب کچھ سُنا اور اُٹھ کر چلا گیا۔

اصغر صاحب کو جب اس بات چیت کی اطلاع ملی تو وہ غصے میں پاگل ہو گئے۔ اُن کی توہین کی گئی اس کی سزا صمد صاحب کو ضرور ملے گی۔ مینجر نے اُن کو یقین دلایا کہ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے وہ ہر چیز کا بندوبست کر لے گا۔

صمد صاحب کے فیصلے سے شمشیر کی حالت بھی دیوانوں کی سی ہو گئی۔ انیسہ کا نہ ملنا! وہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ شمشیر اس کو ایک بار اور دیکھنے کے لئے بے قرار تھا۔ وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکا کہ کیا کرنا چاہیے۔ اُس نے ہر چیز اپنی ماں پر چھوڑ دی۔ لیکن ماں غریب کیا کر سکتی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی شخص صمد صاحب کی مخالفت کی ہمت کر سکتا ہے۔ شمشیر کی مایوسی حد سے زیادہ ہو گئی۔ اسی حالت میں وہ مینجر کے پاس پہنچا۔ مینجر نے بے شک اُسے صحیح مشورہ دیا۔

اور دو تین دن کے بعد گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ شمشیر باپ کی مرضی کے خلاف انیسہ سے شادی کرلے گا صمد صاحب کو بھی یہ اطلاع ملی۔ شمشیر کل سے گھر نہیں آیا تھا۔ وہ علی اصغر صاحب کے گھر میں تھا۔ صمد صاحب کو اپنی زندگی میں ایسا صدمہ نہیں پہنچا تھا لیکن گھبرانا وہ جانتے ہی نہیں تھے۔ مصائب اور مشکلات جس شکل میں بھی سامنے آئیں وہ ان کا مقابلہ کریں گے۔ زندگی کے آخری موڑ پر وہ یہ نہیں دیکھ سکتے تھے کہ ان کی اصولوں کی عمارت اس طرح ڈھے جائے۔

دوسری صبح زمیندار کے گھر میں مسرت کے ترانوں کے ساتھ شروع ہوئی سارا گاؤں تقریب کی تیاریوں میں مشغول تھا۔ آج زمیندار کی لڑکی کی شادی ہے۔

صمد صاحب اپنے گھر میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ زندگی میں پہلی بار ان کے ضابطے میں فرق آیا تھا۔ وہ نہانا بھول گئے۔ اُنہیں کھانے کا ہوش نہ رہا۔ صبح پر شام چھا گئی۔ شادی تھوڑی دیر میں ہونے والی ہے۔

پاگلوں کی طرح ٹہلتے ٹہلتے صمد صاحب دفعتاً رُک گئے۔ اور انہوں نے اپنی بیوی کو پکارا۔ انہوں نے اُن سے پوچھا۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ بڑھاپے میں مجھے ایسی ذلّت اور شکست کیوں ہوئی؟

اگر یہ آخری آزمائش ہے تو پھر اس کے بعد رہ ہی کیا جائے گا۔"

صمد صاحب کا پارہ چڑھتا ہی گیا۔ وہ چلّا کر بولے۔ "یہ شادی نہیں ہوسکتی، ہرگز نہیں ہوسکتی۔ میں اس کو روک دوں گا۔"

اُنہوں نے ڈنڈا ہاتھ میں لیا۔ اور نکل کھڑے ہوئے۔ صالحہ ان کو روک نہ سکی۔

شادی بغیر کسی جھگڑے کے ہوگئی۔ شمشیر گھر کے اندر لے جایا گیا، دُلہن کے پاس بٹھایا گیا۔ نامعلوم مسرتوں کے ساتھ اس نے شربت کا گلاس انیسہ کے ہونٹوں سے لگانے کے لئے اٹھایا۔ دفعتاً باہر ہُلّڑ ہونے لگا۔ شور وغل کے درمیان اُسے یوں سنائی دیا جیسے کوئی پکار رہا ہے —

"شمشیر! مار ڈالا۔"

علی اصغر صاحب نے صمد صاحب کے ہنگامے کے ڈر سے دروازے پر کچھ لٹھ بند متعین کر دیئے تھے۔ صمد صاحب جب گھر سے نکلے تو ان ہی سے مُڈبھیڑ ہوئی۔ لٹھ بندوں نے صمد صاحب کو روکا، وہ بے قابو ہوگئے اور انہوں نے ان لوگوں کو پیٹنا شروع کر دیا۔ ان لوگوں نے بھی جواب دیا اور صمد صاحب کو چمٹ گئے۔ لاٹھی ان کے سر پر پڑی اور وہ چلّا اُٹھے۔ "شمشیر! مار ڈالا۔"

شمشیر کا ہاتھ کانپا۔ وہ شربت کا گلاس انیسہ کے ہونٹوں سے

لگا نہ سکا۔ تھوڑی دیر اس کا دماغ چکراتا رہا۔ اس نے گلاس پھینکا اور دوڑتا ہوا باہر آیا۔ دروازے پر پہنچا جہاں صمد صاحب بے رحمی کے ساتھ پیٹے جا رہے تھے۔ اس نے لٹھ بندوں کو روکا اور "باپ جان!" کہہ کر صمد صاحب سے چمٹ گیا۔ شمشیر کے سر پر ایک ساتھ دو تین لاٹھیاں پڑیں۔ وہ لاٹھیاں جو صمد صاحب کو مارنے کے لئے اُٹھائی گئی تھیں۔ شمشیر صمد کے قدموں پر گر گیا۔ صمد صاحب رونے لگے۔ شاید اپنی زندگی میں پہلی بار وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ شمشیر نے آنکھیں کھولیں اور صرف اتنا کہہ پایا "باپ جان! معاف" وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

لٹھ بند بھاگ کھڑے ہوئے۔ صمد صاحب کو ہوش آچکا تھا۔ بیٹے کی میت کو داہنے ہاتھ سے اٹھایا۔ کندھے پر لادا اور گھر کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ اُن کا بایاں ہاتھ بالکل ٹوٹ چکا تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی انہوں نے درد بھری آواز میں اپنی بیوی کو مخاطب کیا۔ "صالحہ! شمشیر واپس آگیا"۔

صالحہ اس منظر کی تاب نہ لا سکی۔ "یہ شمشیر کو کیا ہوا"۔ اس کی زبان سے صرف اتنا ہی نکلا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

صمد صاحب خاموش تھے۔ پھر خود ہی چلّا کر بولے "رو مت!

صالحہ! رومت! میرے بیٹے نے آبرو رکھ لی۔ مجھ کو ذلت اور شکست سے بچا لیا۔ میرے بچے نے اُن اصولوں کو ٹوٹنے نہ دیا جن کے لئے میں نے زندگی بھر جدوجہد کی تھی، رومت! میں نہیں روؤں گا۔ ہم میں سے کوئی نہیں روئے گا۔"

علا۔الدین الآزاد

ترجمہ: یونس احمر

چھتری

گاؤں کی سڑک جس جگہ تھوڑی سی کشادہ ہوئی ہے، اس کے پاس ہی ایک پتلی چھوٹی سی گلی نکل گئی ہے۔ اُس پر لوگوں کی نگاہیں بہت کم پڑتی ہیں۔ البتہ جب مسافروں سے لدی لدائی بڑی سی بس شور مچاتی اور گرد اُڑاتی آگے گذرتی ہے اُس وقت جو راہ گیر ناک میں رومال رکھ کر پیچھے مُڑ جاتے ہیں غالباً اُن کی نگاہیں اُس تنگ سی گلی پر پڑ جاتی ہوں گی۔ داہنی طرف بڑے سے مکان کے سامنے ہاتھ کا سہارا لے کر آگے بڑھئے تو محسوس ہوگا کہ آپ پہاڑ کی کسی سُرنگ میں داخل ہو رہے ہیں۔ چاروں طرف تاریکیوں کا جال سا بنا ہوا ہے۔ نیچے نالی بہتی ہے۔ گلی میں داخل ہوتے وقت جن کے پاس رومال نہیں وہ بائیں ہاتھ سے ناک پکڑ کر سانس روکنے کی کوشش کرتے ہیں ـــــ اسی طرح کچھ دُور آگے

نکل جائیے تو آپ دیکھیں گے کہ ایک بڑا سا امرود کا درخت پھیلا ہوا ہے۔ جس کے نیچے ہی ایک مکان ہے۔ برآمدہ کشادہ اور بڑا سا ہے اس لئے یہاں بہت ساری چیزیں رکھی ہوئی ہیں ـــــ مثلاً ٹوٹی پھوٹی کرسیاں، لکڑیاں، سوکھی گھاس کا ڈھیر اور دروازہ کے قریب بید کا ایک پرانا صوفہ ـــــ جو پڑا پڑا اپنی قسمت کو رو رہا ہے۔

بارہ تیرہ سال پہلے اسی صوفہ پر بیٹھکر اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ امین الدین خوش گپیاں اور خوش فعلیاں کیا کرتا تھا ـــــ سرکاری دفتر سے اس کو ایک سو پچیس روپے مل جاتے ہیں۔ بڑا لڑکا چٹائی پر بیٹھ کر جیومیٹری کا فارمولا حفظ کر رہا ہے اور چھوٹے لڑکے کے سامنے پہلی اور دوسری کتاب رکھی ہوئی ہے ـــــ اور سامنے سے دھوئیں کے جو بادل اُٹھ رہے ہیں اُس سے امین الدین کی پریشانی اور بڑھتی جا رہی ہے۔

رقیہ بانو کے بڑے سے بڑے دشمن بھی یہ کہتے ہوئے خوف کھاتے ہیں کہ اس کی طبیعت ناساز ہے۔ لیکن ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا اور فکر و تردد میں خواہ مخواہ وقت برباد کرنا اُسے اچھا بھی نہیں معلوم ہوتا۔ امین الدین اس کی جلی کٹی سب کچھ سنتا ہے کہنے کی ہمت نہیں ہے۔ اس کی آنکھوں میں سستے قسم کی فریم والی عینک ہے جس کی

اندر سے جھانکتی ہوئی آنکھیں کچھ سوچنے میں منہمک رہتی ہیں — اور یہ سوچ بیوی کی محبت اور اُس کی خوبصورتی کے علاوہ اور کچھ ہو کیا سکتی ہے۔

لیکن اتنی ساری محبت اور چاہت کے باوجود اتنا کہا جا سکتا ہے کہ امین الدین اپنی بیوی کو اچھی طرح سمجھ نہیں پایا ہے۔ امین الدین نے سوچا تھا کہ شادی کے بعد اس کی زندگی کی کایا پلٹ ہو جائے گی۔ اُس نے سوچا تھا کہ اس کی بیوی جب میکے جائے گی تو تنہائی میں بیٹھ کر وہ شاعری کرے گا۔ ہجر و فراق کے گیت لکھے گا لیکن اس کو یہ دیکھ کر بیحد مایوسی ہوئی کہ خیالات صرف خیالات بن کر رہ گئے۔

لیکن یہاں تو قصہ ٹھیک اس کے برعکس ہے۔

ان کی زندگی کا جیسے ایک معمول بندھ چکا ہے۔ ادھر شام کا اندھیرا پھیلا اور اُدھر بچوں کو کھانا وانا کھلا کر رقیہ بانو صاف ستھری ہو گئی۔ وہ اپنے بچوں کو اوروں سے بالکل الگ تھلگ رکھنے کی عادی ہے۔ چٹائی کے اوپر امین الدین کا کھانا چُن کر ایک طرف خود بھی کھانا لے کر بیٹھ جاتی ہے۔ امین الدین نہ تو منع کرتا ہے اور نہ کچھ محسوس ہی کرتا ہے۔ کیونکہ اب وہ اپنی آنکھوں سے برابر یہ بھی دیکھ رہا ہے کہ عورتیں خود بازار جانے لگی ہیں اور تو اور شوہر کے نام تک لینے سے خوف نہیں کھاتیں۔ ایک

ساتھ بیٹھکر کھانا کھانا تو اب معمول سا ہو گیا ہے۔ امین الدین تو خوش ہے کہ وقت کی تبدیلی کے ساتھ رقیہ بانو بھی بدل گئی ہے۔ کھانے سے فارغ ہو کر رقیہ بانو بچھونے کے اوپر لالٹین رکھ دیتی ہے۔ اور اسی عرصہ میں حقّہ بھی تیار ہو جاتا ہے۔ امین الدین اور رقیہ کے سامنے صرف پان کی ڈبیا حائل ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر اس طرح گذر جانے کے بعد لالٹین دھیمی کر دی جاتی ہے۔ بچے پلنگ کے نیچے سوتے ہیں۔ ان نادار غریبوں کو توشک اور گدّا کہاں نصیب۔

اسی ادھیڑ بن میں کافی وقت گذر جاتا ہے۔ امین الدین بیٹھا بیٹھا حقّہ کھینچتا جاتا ہے اور دھوئیں کے بادل پھیلتے جاتے ہیں۔ کچھ پرے سڑک پر راہ گیروں کے چلنے کی آواز سنائی دی جاتی ہے۔ لیکن گھر کے اندر خاموشی اور سکوت کا گہرا جال سا بنا ہوا ہے۔ البتہ کبھی کبھی منجھلی لڑکی چیخ پڑتی ہے تو برآمدہ کے قریب مرغی بھی چونک اٹھتی ہے اور اس طرح گہری خاموشی کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ پان کی ڈبیہ رکھتے ہوئے رقیہ بانو بولی ـــ "اجی سُنتے بھی ہو!"

"ہنھ!" ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔

"سُنتے ہو ہماری مرغی نے دو انڈے دیئے ہیں؟"

"ہنھ!"

"تم نے کہا تھا ذبح کرا دو۔ ذبح کر دیتے تو پھر انڈے کہاں سے آتے۔ تمہاری باتیں بھی بڑی عجیب ہوتی ہیں۔"

"ہُنہہ!"

"مرغی اچھی نسل کی معلوم ہوتی ہے۔ میں تو دیکھ کر ہی سمجھ گئی تھی۔ مگر تم تو ذبح کرنے پر تُل جاتے ہو۔ تم جانتے ہو گے کہ بازار میں فی مرغی کتنے کو بکتی ہے ـــــ مرغیاں پال پال کر تو میرے گاؤں میں آبندا کی ماں ٹین کا گھر بنا چکی ہے۔"

امین الدین اب تک خاموش ہے۔ اس کی سانس کی رفتار تیز ہو چکی ہے۔ رقیہ بانو سے برداشت نہ ہو سکا تو ٹہوکا دیتے ہوئے بولی ـــــ

"بھئی سو گئے کیا!"

"ہُنہہ!"

رقیہ بانو کی آواز یکایک گونج اٹھی ـــــ "آخر اس ہُنہہ ہُنہہ کا کیا مطلب ہے۔"

پھر وہی گہری خاموشی!

کبھی کبھی بستی کے کُتے بھونکنے لگتے ہیں اور جھینگر کی آواز سنائی دے جاتی ہے۔ یکایک گھر کے چھپر کے پاس امرود کے درخت کے اُوپر چُپ چاپ ایک اُلّو آ کر بیٹھ گیا۔

سویرے کوّے کی آواز سنتے ہی، رقیہ بانو جاگ گئی۔ نہا دھو کر

اور سفید ساڑھی پہن کر اُس نے صبح کی نماز پڑھی۔ نماز ختم ہوئی تو باورچی خانہ میں چلی گئی۔

غرض اسی طرح چاروں موسم آتے ہیں اور گذر جاتے ہیں — اب آنسوؤں کا سیلاب لے کر بارش کا موسم شروع ہو چکا ہے۔

اساڑھ کا مہینہ ختم ہو رہا ہے مگر بارش ہے کہ تھمتی ہی نہیں۔ باورچی خانہ سے جو تھوڑی دور پر بڑا سا نالہ بہہ رہا ہے۔ دالانوں کے اوپر کا چھپر ٹپکنے لگا ہے۔ چاروں طرف کیچڑ ہی کیچڑ ہو گئی ہے۔ رقیہ بانو دالان صاف کرتے کرتے پریشان سی ہو چکی ہے۔ اپنے قریب کسی کو نہ پا کر خود ہی بک بک کرنے لگتی ہے — "خدایا آخر یہ کن گناہوں کی سزا ہے؟"

ایک بچی نے کہا۔ "ابّا کے دفتر کا وقت ہو گیا"

اب کیا تھا رقیہ بانو کو آ گیا غصّہ۔ اُس نے بچی کے الفاظ کے جواب میں کہا —

"صوفہ پر بیٹھے بیٹھے اور کیسے الفاظ نکلیں گے۔ سویرے سے رات تک سب ایک قیامت ہے — وہی اُدھیڑ بن، وہی بک بک جھک جھک — جہنم میں جائے ایسی شادی"

امین الدین نے پائجامہ پہنتے پہنتے سب کچھ سُنا۔ اُس کے

ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور ایک ہلکا سا تبسم نمودار ہوا۔

بڑے لڑکے ننّو کے اسکول کا بھی وقت ہو گیا ہے۔ وہ آئینہ سامنے رکھ کر سر کے بال درست کر رہا ہے اور اپنے چہرے کا جائزہ بھی لیتا جا رہا ہے۔ امین الدین کی نظر پڑی تو اُسے ہنسی آ گئی۔ زمانہ کتنی تیزی سے بدل رہا ہے۔ ایک وقت وہ بھی تھا کہ امین الدین کا سر مُنڈا رہتا تھا۔ بڑے بڑے بال رکھنے کی قطعی ممانعت تھی — مگر اِس زمانہ کے بچّے — اُن کی تو بات ہی الگ ہے۔

کھانا چُن دیا گیا۔

بچّے کو بھی بیٹھتے دیکھ کر رُقیہ بانو گرج اٹھی۔ "ارے پھر تُو کھانے کو بیٹھ گیا — چل اُٹھ۔ پیٹ نہیں ہے جیسے دوزخ کی آگ سُلگ رہی ہے اس کے اندر!"

"تو کیا اسکول نہ جاؤں"؟ ننّو نے مُنہ پُھلاتے ہوئے کہا۔

"اسکول؟" رقیہ نے جھلّا کر کہا — "اس بارش میں اسکول؟"

ننّو ہے تو چھوٹا مگر عقل میں بڑے بڑوں کے کان کاٹتا ہے۔ وہ اطمینان سے بیٹھ گیا اور کھانے لگا۔ ایک بار تو رقیہ اس کی مرمّت کر دیتی مگر امین الدین نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ اُس نے کہا۔ "بھئی کھانے دو۔ اسکول نہ سہی مگر کھانے سے کیوں روکتی ہو۔ شاید بھوک لگی ہو اُسے!"

"جب سُنو بھُوک لگی ہے۔ ہر وقت بھُوک۔" رقیہ بانو کا غصّہ تیز ہو گیا۔

بارش کچھ تھم ضرور چکی ہے مگر اب بھی باہر جانا مشکل ہے۔ صحن میں پانی جم چکا ہے۔ جُوتے پہننا بھی مصیبت ہے۔ اور پھر باہر نکلو تو پائجامہ سنبھال کر۔ ایک ہاتھ سے چھتری پکڑے، دوسرے ہاتھ سے پائجامہ۔ امین الدین برابر ان آفتوں سے دوچار ہوتا ہے۔

ننّو کچھ سوچ رہا ہے۔ اس کے چہرے بُشرے سے ایسا ظاہر ہو رہا ہے جیسے وہ بڑا غیرت مند لڑکا ہے۔ لیکن اُس نے کن انکھیوں سے رقیہ بانو کو دیکھا۔ آہستہ آہستہ میز پر سے کتابیں لیں اور بستہ بغل میں دبا خرگوش کی طرح بھاگا۔

صحن سے گذرا تو پانی کی آواز آئی۔

"ننّو!" رقیہ نے پکارا۔ آواز ایسی تھی جیسے کہیں بجلی گر پڑی ہو۔

ننّو آگے نہ بڑھ سکا — سامنے رُخ کر کے کھڑا رہا۔

رقیہ بانو کی آواز سُنائی دی۔ "ادھر آ، جلدی۔"

ننّو اس طرح آگے بڑھا جیسے وہ خود نہیں جا رہا ہو، اُس کے پاؤں اُسے کھینچ کر لے جا رہے ہوں۔ وہ برآمدہ کے قریب پہنچکر کھڑا ہو گیا — سر جھکا ہوا ہے جیسے اُس نے بہت بڑا جُرم کیا ہو۔ رقیہ بانو

نے اُس کے بڑے بڑے بال پکڑ کر سامنے گھسیٹا اور داہنے ہاتھ سے طمانچے رسید کرنے لگی۔

"سرکش، بیہودہ، میں نو ماہ تک اس سرکش کو ڈھوتی پھری اور یہ ....." وہ ہانپنے لگی ــــ "کتنا زبردست لڑکا ہے یہ۔ دن دھاڑے چوری۔ چھتری لے کر بھاگ رہا ہے۔"

امین الدین سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ برداشت نہ ہو سکا تو اس نے کہا۔ "ارے چھوڑ کیوں دیا تم نے۔ لگاؤ دو تین ہاتھ اور۔ اتنی عمر ہو گئی لیکن عقل ذرا بھی نہ آئی۔"

"باپ رے باپ" بچے کو کھینچ کر اور گال پر طمانچہ رسید کر کے رقیہ بانو بولی۔ "چور کی طرح چھتری کو لگائے بھاگ رہا تھا ــــ زبان کیوں بند ہو گئی تیری ــــ مُنہ توڑ دوں گی یاد رکھ۔"

ننّو مار کھاتا گیا مگر آواز نہیں نکلی۔ برداشت کرتا گیا مگر کہاں تک اور کب تک۔ آنکھیں ملتے ملتے اُس نے کہا ــــ "اسکول جا رہا تھا۔" اور یہ کہہ کر اُس کی آنکھیں ساون بھادوں بن گئیں۔ چھوٹی بچی اپنی اُنگلی چوستے ہوئے دیکھنے لگی۔

امین الدین سر جھکائے نہ جانے کیا سوچ رہا ہے۔ عینک سے ڈھکی ہوئی آنکھوں میں خیالات کی پرچھائیں پڑ رہی ہے۔ وہ جیب

میں اپنے دونوں ہاتھ ڈالے اس طرح کھڑا ہے جیسے اب تقریر شروع ہوگی۔ رقیہ سب کچھ دیکھ رہی ہے۔ اُس نے چھتری ہاتھ میں گھماتے ہوئے کہا — " بڑے شریف آدمی کی طرح کھڑے ہو — اب دفتر جانے میں دیر نہیں ہو رہی ہے۔ کچھ دیر پہلے تو برس پڑے تھے "!

" او، ہاں — جا رہا ہوں "

برآمدہ تک پہنچ کر امین الدّین نے ننّو سے کہا — " چلو میرے ساتھ، اسکول تک پہنچا دوں گا "

ننّو تعجب خیز نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھنے لگا — اسکول کی سڑک اور دفتر کی سڑک دونوں مختلف سمتوں میں ہے۔ ننّو باپ کا اشارہ پاکر چھتری کے نیچے آگیا۔ دونوں ایک ساتھ جانے لگے اور رقیہ بانو پان کی ایک گلوری منہ میں رکھ کر عجیب سی شکل بنانے لگی۔

بارش کچھ ختم چکی ہے مگر اتنی نہیں کہ کپڑے نہ بھیگیں۔ باپ بیٹے جہاں آکر کھڑے ہوئے ہیں وہیں سے دو سڑکیں نکل گئی ہیں۔ چھتری ننّو کے ہاتھ میں دیتے ہوئے امین الدین نے کہا — " لو، تم چھتری لے کر جاؤ۔ اسکول کی گھنٹی بجنے ہی والی ہے "

" اور آپ " ننّو نے رحم آگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

امین الدین کو ہنسی آگئی۔ اُس نے کہا " میرے بارے میں

نہ سوچو۔ بس آ ہی جائے گی۔ میں چلا جاؤں گا۔ ہاں تم جاؤ۔" اس کے بعد امین الدین نے نہ جانے ننّو کے کان میں اور کیا کچھ کہا۔

ننّو نے کہا۔ "اچھا!"

امین الدین بس اسٹینڈ کی طرف بھاگا۔ صرف تھوڑی دیر بس کا انتظار کرنا پڑا۔

میز پر فائلوں کا انبار لگا ہوا ہے۔ امین الدین ایک ذرا جھک کر اور چشمہ سے ڈھکی ہوئی آنکھوں کو بند کر کے کچھ سوچنے لگا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ بالکل تھکا ہوا ہے۔ قمیص کے بٹن تمام کھول ڈالے ہیں، اور اندر بنیان پسینے سے شرابور ہے۔ اُس نے کام شروع کیا۔ پاس ہی اس کا ساتھی عطاء الحق خان بھی بیٹھا ہے ــــ بڑا ہی گپّی۔ اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔ کبھی قصہ کہانی ہے، کبھی لطیفے ہیں۔

ظہر کی نماز کے بعد ایک گھنٹہ کی چھٹی ہوئی۔ عطاء الحق ہنستے ہوئے امین الدین کی میز کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اور اُس کی طرف "موہنی" بیڑی بڑھاتے ہوئے بولا ــــ "لو بھئی پیو۔"

امین الدین نے بیڑی لے لی۔

عطاء الحق نے کہا ــــ "سوچ کیا رہے ہو آخر! اور پھر سوچنے سے ہو گا کیا۔ جو ہونا ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گا۔ ہونے والی بات کو نہیں

روک سکتا ہوں اور نہ تم۔"

"ہاں" امین الدین نے جواب دیا۔

"ارے بھئی تمہارے کپڑے تو بھیگے ہوئے ہیں۔ چھتری نہیں رکھتے کیا؟"

"چھتری ہے۔ لانا بھول گیا۔"

خان نے کہا ۔۔۔ "اچھا۔ مگر بارش کے دنوں میں ایسی بھول سے پریشانی اٹھانا پڑتی ہے۔ عجیب دنیا ہے ہم لوگوں کی بھی۔ اپنے آرام چین کی پروا تک نہیں۔"

خان ان باتوں سے امین الدین کو تکلیف پہنچانا نہیں چاہتا تھا مگر اس نے کچھ محسوس کیا۔ اس نے چپ سادھ لی۔ یہ سچ ہے کہ کپڑے بھیگ گئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اُسے کچھ سردی سی محسوس ہونے لگی ہے۔

دفتر کا وقت ختم ہوتا ہے مگر بارش بند نہیں ہوتی ہے۔ دوپہر کے وقت جب آسمان صاف ہو گیا تھا تو امین الدین کے دل میں بہت ساری آرزوئیں پیدا ہوئی تھیں مگر جوں جوں وقت بڑھتا گیا آسمان پر سیاہ بادل چھاتے گئے۔ بارش ہو رہی ہے۔ امین الدین دفتر کے برآمدہ میں کھڑا ہو گیا۔ بارش بند کیا ہوتی اور موسلادھار

برسنے لگی۔

دفتر کا ایک ساتھی چھتری لے کر آ رہا ہے۔ امین الدین یہ کہہ کر کہ "بس اسٹینڈ تک جائیں گے کیا؟" اُس کی چھتری کے نیچے آ گیا۔ امین الدین کی اس حرکت پر اُسے بُرا ضرور معلوم ہوا مگر کچھ کہہ نہ سکا۔

ننّو ایک دکان کے نیچے ہاتھ میں چھتری لے کر کھڑا ہے امین الدین نے اُسے دیکھ کر کہا — "جلدی چلو۔ اندھیرا ہو رہا ہے"۔ چھتری اپنے ہاتھ میں لے لی۔

سچ مچ اندھیرا ہو چکا ہے۔ بادل تیزی سے جمع ہوئے ہیں۔ امین الدین کو جلد گھر پہنچ جانا چاہیے۔ وہ جانتا ہے کہ پہنچنے میں دیر ہوئی تو رقیہ بانو کے تُرش الفاظ کی بھی بارش شروع ہو جائے گی۔ رقیہ چاہتی ہے کہ بچّے ہوں یا شوہر — سب شام سے پہلے پہلے گھر پہنچ جائیں۔

چھتری بند کر کے دونوں گھر کے اندر داخل ہوئے۔

امین الدین نے کہا — "میں چھتری لے کر پہلے جاتا ہوں، تو بعد میں آنا۔ سمجھے۔ تاکہ تیری ماں کو شُبہ تک نہ ہو"۔

ننّو خاموش رہا۔

رقیہ بانو نے دیکھتے ہی پوچھا — "یہ کپڑے کیسے بھیگ گئے؟"

"بس بھیگ گئے"۔ امین الدین نے بڑی بے پروائی سے جواب دیا۔

"مطلب!"

"ذرا باہر جاکر دیکھو ــــ کتنے زور کی ہوا چل رہی ہے۔ چھتری سے آخر کتنا بچاؤ ہوسکتا ہے"۔ یہ کہہ کر امین الدین مُنہ ہاتھ دھونے کے لئے کمرہ سے نکل گیا۔

"ننّو!"

"جی اماں جان"

رقیہ بانو نے پوچھا۔ "اسکول سے کیسے آئے۔ کپڑے بھیگ گئے کیا؟"

اس نے جواب دیا "میرا ایک ساتھی مجھے پہنچا گیا ہے۔ اُس کے پاس چھتری تھی۔"

رقیہ بانو امین الدین کے پاس گئی اور بولی: "ننّو بھی تو چھتری کے نیچے آیا مگر اُس کے کپڑے نہیں بھیگے"!

امین الدین نے جواب دیا۔ "ارے بھئی وہ تو بچہ ہے۔ اس کے بدن پر ہاف پینٹ اور ہاف شرٹ ہے۔ بچّوں کی بات الگ ہے"!

امین الدین کے اس جواب سے رقیہ بانو کو اطمینان ہوا یا نہیں۔ کہا نہیں جا سکتا۔

رات ہوگئی!

کھانے پینے سے فراغت پاکر رقیہ بانو پتیلی کی چمچی میں سرسوں کا

تھوڑا سا تیل لے کر چراغ کی لو میں گرم کرنے لگی۔ اوپر سے لہسن کے دو تین جوے بھی کچل کر ملا دیئے۔ تیل گرم ہو چکا تو رقیہ بانو پلنگ پر آئی اور امین الدین کے جسم پر مالش کرنے لگی۔ امین الدین نے بڑا آرام محسوس کیا۔ جسم میں زیادہ گوشت نہیں ہے تاہم پاؤں کے تلوے انگلیوں کے درمیانی حصے، گھٹنے کے نیچے، چھاتی اور پشت پر گرم تیل بڑا اچھا لگا۔ رقیہ بانو مالش کرتی جا رہی ہے اور چراغ کی لو کو دیکھ کر امین الدین سوچ رہا ہے ـــــ جس کی بیوی نہیں اس سے بڑھ کر دنیا میں اور بد نصیب کون ہوگا۔ امین الدین رقیہ بانو کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے ـــــ وہ اس عالم میں کتنی خوبصورت نظر آ رہی ہے۔

امین الدین کو یکایک کھانسی آ گئی۔

رقیہ بانو نے کہا ـــ "لو کھانسی بھی شروع ہو گئی"۔

اور اسی اثنا میں چھتری کی بات تازہ ہو گئی۔ اس کا ایک سبب بھی ہے۔ بہت دن پہلے کی پرانی ٹوٹی پھوٹی ایک چھتری تھی۔ گذشتہ موسم گرما میں اس کی حالت اور خراب ہو گئی۔ چھتری کا کپڑا تھا تو سیاہ لیکن سیاہی مٹ کر سفیدی ظاہر ہونے لگی تھی۔ اس کے تار بھی کمزور ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ کسی طرح کام چلا رہا تھا۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ کچھ دن بعد اس کا کپڑا جگہ جگہ سے پھٹ گیا۔ امین الدین

سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے چھتری کے بارے میں کچھ سوچا تک نہیں تھا مگر اُسے خیال آیا کہ قمیص کے نیچے پھٹی بنیان تو چل سکتی ہے لیکن کوئی ٹوٹی پھوٹی چھتری لے کر باہر کیسے جائے گا۔ سبھوں کی نگاہیں پڑیں گی۔ کتنی شرم کی بات ہے۔

اُدھر رقیہ بانو بھی اس پھٹی پُرانی چھتری کو دیکھ کر اداس ہے۔ وہ سوچتی ہے — چھتری بہت ضروری ہے۔ یہ باد و باراں سے بچاتی ہے۔ دھوپ کی تمازت سے محفوظ رکھتی ہے۔ کہیں بھی چلے جائیے، چھتری پاس ہے تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ رقیہ بانو نے امین الدین کو مشورہ دیا کہ روزانہ پیٹ کاٹ کر پیسے بچائیں گے۔ اور جب پیسے جمع ہو جائیں تو تم ایک اچھی سی چھتری خرید لینا۔ لیکن یہ مشورہ صرف مشورہ بن کر رہ گیا۔ پیسے کیونکر جمع ہوتے۔ آمدنی کم، خرچ زیادہ۔ اتنے بال بچّے، ضرورتیں کم نہیں۔ اور پھر ایک آدمی کیا کر سکتا ہے۔ اُدھر چیزوں کے دام روز بروز بروز بڑھ رہے ہیں اور آمدنی میں کوئی اضافہ نہیں۔ لیکن رقیہ بانو فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ کسی طرح پیسے پس انداز کر کے ایک نئی چھتری ضرور خریدیگی۔ اُس نے روزانہ دو آنہ پس انداز کرنا شروع کیا اور اس کے علاوہ چُپ چاپ اعلیٰ افسران کی بیگمات کے ہاتھوں مرغیاں بیچ بیچ کر اس نے پیسے جمع کر ہی لئے۔ رقیہ بانو کی یہ بہت دنوں کی خواہش تھی کہ نماز پڑھنے

کے لئے ایک اچھی سی ساڑی ہونی چاہئے۔ اتوار کو جب دفتر بند رہا تو رقیہ بانو نے امین الدین کے سامنے گیارہ روپے رکھ کر کہا ـــــ

" جاؤ چھتری خرید کر لے آؤ۔ اور ہاں سیدھے گھر آجانا "۔ ساتھ ہی ساتھ رقیہ بانو نے ایسی تیکھی نگاہوں سے امین الدین کو دیکھا کہ وہ رُک نہ سکا۔

چھتری آئی۔ بڑی محنت سے امین الدین نے اُس پر اپنا نام اور گھر کا پتہ لکھا۔ خدانخواستہ گُم ہو جائے تو ملنے میں دشواری نہ ہو۔

امین الدین کے جسم پر تیل کی مالش کرتے کرتے رقیہ بانو کو ساڑی کی بات یاد آگئی ـــــ وہ سوچتی کہ کاش ایک اچھی سی ساڑی ہو جاتی ـــــ تو نماز پڑھنے میں اتنی دشواری نہ ہوتی۔ اسی سوچ میں رات کا پہیہ گھومتا گیا اور دونوں میاں بیوی خواب کے جزیرے میں گم ہو گئے۔

صبح ہوئی!

دن کی رفتار کے ساتھ ساتھ آسمان کی رفتار بھی تیز ہو گئی ہے۔ کالے کالے بادل امنڈتے ہوئے گرج دھمک کے ساتھ برستے ہیں، برستے جاتے ہیں۔ ہر طرف پانی ہی پانی۔ جدھر دیکھو کیچڑ۔ باورچی خانہ تک سلامت نہیں۔

مگر امین الدین کو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہنا نہیں آتا۔ گھڑی

نے دس بجائے اور وہ چھتری لے کر کھڑا ہو گیا۔ ننّو بھی اس کے ساتھ روانہ ہوا۔

بس اسٹینڈ پہنچ کر امین الدین نے کہا — "لے چھتری۔ تو چلا جا۔ دیکھ گھنٹی بجنے ہی والی ہے"

ننّو کو باپ کے حکم کی تعمیل کرنا ہی پڑتی ہے۔ تھوڑی دیر چھتری ہاتھ میں لے کر وہ کھڑا رہا۔ اس نے دیکھا — امین الدین بارش میں بھیگتے بھیگتے بھاگا جا رہا ہے۔ جوتے سے کیچڑ اُچھل اُچھل کر اس کا پائجامہ خراب کر رہی ہے، سر بھیگ رہا ہے۔ ننّو کے ننھے سے دل کو تکلیف ہوئی۔ اُس نے کچھ محسوس کیا۔ اتنے میں بس آگئی۔ امین الدین سوار ہو گیا۔ اور بس جانے لگی تو اس نے بھی چلنا شروع کیا۔

سہ پہر کو اسکول سے چھٹی ہوئی۔ وہ مقررہ جگہ پر آکر انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد امین الدین آگیا۔ دونوں ایک ساتھ جانے لگے۔ گلی کے نکڑ پر پہنچتے ہی دونوں رُک گئے۔ امین الدین ہاتھ میں چھتری لے کر گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ اس کے کچھ دیر بعد ننّو اندر گیا۔

اسی طرح ایک ہفتہ گذر گیا۔ امین الدین کی کھانسی بڑھتی گئی۔ اب کھانسی ہوتی ہے تو رُکتی ہی نہیں۔ سینہ میں درد شروع ہو گیا ہے۔ سر میں چکر ہے۔ کچھ بخار سا بھی محسوس ہونے لگا ہے۔ اب تھوڑا سا کام

بھی اُس کے لئے بوجھ سا بن گیا ہے۔ پہلی سی بات نہ رہی۔

غالباً سنیچر کا دن ہو گا۔ فائلوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ افسر کی وارننگ کی وجہ سے بڑی جلدی جلدی کام کر رہا تھا کہ یکایک اُس کا سر میز پر آ گیا۔ عطاء الحق نے پوچھا اور فوراً آ کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

خاموشی!

عطاء الحق نے اس کے جسم پر ہاتھ رکھا، وہ کانپ اُٹھا۔ "ارے کافی بخار ہے تمہیں۔ ایسی حالت میں کیسے کام کر سکو گے۔ جہنم میں جائے ایسی ملازمت۔ زندگی رہی تو محنت کر کے پیسے پیدا کر لو گے۔" یہ کہہ کر عطاء الحق نے درخواست لکھ کر ہیڈ کلرک سے چھٹی دلائی اور گھر تک رکشا پر پہنچا آیا۔ اس وقت اڑھائی بجے ہوں گے۔

رقیہ بانو کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ امین الدین کو بخار آ سکتا ہے۔ اُسے دیکھ کر وہ دم بخود ہو گئی۔ اُس کا دل پھٹنے لگا۔ اُسے خوف محسوس ہوا۔ خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو ڈاکٹر کہاں سے لائے۔ رقیہ بانو امین الدین کے جسم پر گرم تیل کی مالش کرنے لگی۔

مالش کرتے کرتے یکایک اُسے یاد آ گیا۔ اُس نے پوچھا۔ "چھتری کہاں ہے؟"

امین الدین نے کہا "ارے ہاں میں تو بھول ہی گیا تھا کہنا۔ شاید

دفتر میں چھوٹ گئی۔"

رقیہ بانو پریشان ہوکر پوچھنے لگی۔ "گم تو نہیں ہوگئی؟"

"نہیں۔ سرکاری دفتر سے کوئی چیز گم نہیں ہوسکتی۔"

شام ہوگئی مگر ننّو واپس نہ آیا۔ امین الدین کو پریشانی ہوئی۔ وہ چڑچڑا سا ہوگیا۔

ننّو نے ایک طرف چھتری چھپاکر رکھ دی تھی، اس پر رقیہ بانو کی نظر پڑگئی۔ اس نے ننّو سے پوچھا۔ "کہاں سے ملی یہ چھتری تجھے؟"

ننّو سر جھکائے کھڑا رہا۔

"جواب کیوں نہیں دیتا؟"

اس نے اس طرح نگاہیں جُھکاکر جواب دیا۔ "امّاں جان میرا کوئی قصور نہیں۔ باہر نکل کر ابّا مجھے دیدیتے ہیں اور کہتے ہیں۔ مجھے ضرورت نہیں تو لے کر جا۔"

رقیہ بانو کی نگاہوں کے سامنے ساری باتیں سورج کی روشنی کی طرح صاف اور روشن ہوگئیں۔ پان سے رنگے ہوئے اس کے دونوں ہونٹ کانپنے لگے۔

اس غصہ کے عالم میں رقیہ بانو امین الدین کے بچھونے کے قریب آئی۔ کچھ کہنے کے لئے اس کے لب کُھل رہے ہیں۔ امین الدین کو سردی

لگ رہی ہے اور وہ بُری طرح کانپ رہا ہے۔

"شاید تم نے بھی یہی محسوس کیا ہوگا" امین الدین نے بڑی مشکل سے اتنا کہا۔ رقیہ بانو امین الدین کی اس حالت کو دیکھ کر پھُوٹ پھوٹ کر رونے لگی ـــــ بالکل بچّوں کی طرح۔ وہ روتی جاتی تھی اور اس کے مُنہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے ـــــ "خدایا میں کیا کروں ـــــ ان سارے بچّوں کو لے کر کیا کروں گی۔ یہ چھوٹے چھوٹے بچّے ـــــ معصوم اور بے بس۔ کہاں جاؤں، کس کے سامنے فریاد کروں"

امین الدین کی آنکھیں صرف چراغ کی لو کو دیکھ رہی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد اُس کے جسم کو جنبش ہوئی اور اس نے غصّہ میں چیختے ہوئے کہا ـــــ "صرف نالہ و فریاد، آہ و فغاں اور کچھ نہیں۔ یہ بھی سوچا ہے کہ دنیا کا پہیہ کس انداز سے گھوم رہا ہے"

لیکن رقیہ بانو خاموش نہ رہ سکی۔ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا ـــــ کیونکہ اس کی زندگی میں یہ حادثہ پہلی بار ہوا تھا۔

ابوالفضل

ترجمہ: یونس احمر

شریف

"کسی زمانے میں ہوں گے دھن دولت کے مالک، اب تو ان کے پاس شرافت نامی صرف ایک چیز رہ گئی ہے"۔ گھر کی بہو ہمیشہ پاس پڑوس کی عورتوں سے کہا کرتی ہے۔ اور اس دن بھی امینہ کی ماں سے یہی کہہ رہی تھی ——" ذرا غور تو کرو، اتنا سِن ہو گیا، خدا رکھے پانچ لڑکوں اور ایک لڑکی کی ماں ہوں۔ لیکن آج تک کسی نے مجھے پردے کے باہر دیکھا؟ گھر کے نوکر چاکر بھی میری انگلیوں کے ناخن تک نہیں دیکھ پائے"۔ یہ کہہ کر اس نے جُوتی سے پاؤں باہر نکالا۔ اس کے بعد ڈبیہ سے پان کی دو گلوریاں نکالیں۔ ایک خود کھائی اور دوسری امینہ کی ماں کی طرف بڑھاتے ہوتے بولی۔" مردوں کی بات رہی الگ، کسی بہو بیٹی نے بھی میرے جسم کے کسی حصّے کو دیکھا ہے؟"

پان کی پیک باہر نکلنے لگی تو اس نے آنچل سے پونچھ لیا۔ گھر کی دیوار بھی سلامت نہ رہ سکی۔

چار لڑکوں کے بعد صرف ایک لڑکی تھی اس لئے اڑوس پڑوس میں وہ "سُہاگی" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اپنی ماں کی بڑی لاڈلی تھی۔ اور یہ واقعہ ہے کہ بچپن ہی سے رنگ برنگ کی ساڑیاں زیب تن کرنا اور سونے کے مختلف زیورات سے اپنے کو سجانا اس کا معمول تھا۔

شریف گھرانے کی اولاد کو زیادہ لکھنے پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی طرح خط اُردو میں لکھ لیا جاتا تھا اور پتہ وکیل بابو کے گھر سے لکھا کر لایا جاتا۔ بچوں نے کسی طرح بچپن کا زمانہ گذارا اور جب سیانے ہوئے تو یہ دیکھنے میں آیا کہ اُن کے سر مونڈ دیئے گئے۔ سفید گول ٹوپیاں پہنا دی گئیں۔ جسم پر لمبا کرتا جھولنے لگا، داڑھی استرہ سے بے نیاز تھی۔ پنجگانہ نمازیں پڑھی جانے لگیں اور اس طرح شرافت بھی قائم رہی لیکن طبیعت اندر ہی اندر سے کچھ طلب بھی کر بیٹھتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ یہ سارے فرائض اس سن کے لئے نہیں تھے۔ اس عمر میں تو گناہ کو بھی زندگی میں کچھ دخل ہونا چاہیئے۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ وہ چاہتی ہے لمبے لمبے بال، کلین شو، پائجامہ، پینٹ، شرٹ، کوٹ،

ہنگامہ آرائیاں، کھیل کود، پان، سگریٹ ـــ مگر یہ سب جاننے کے باوجود وہ ادھر مائل ہونے کی جرأت نہ کر پاتے۔ ایک بار بڑے لڑکے کی کیا شامت آئی کہ اس نے بال بڑھا لئے۔ اب کیا تھا، بزرگ خانہ نے آنکھیں لال پیلی کر کے اس کی پشت پر جوتوں کی بارش کر دی۔ اس کے بعد فوراً نائی کو بلایا گیا اور اس کے بال چھوٹے کرا کے ندی کے چاروں طرف سات بار گھمایا گیا۔ تب اسے نجات ملی۔

اور جب شرافت کے روح فرسا مظالم حد کو پہنچ گئے تو یہ لڑکے رنگون، اکیاب، ڈھاکہ، کلکتہ یا پھر جہاں بھی سینگ سمائے نکل بھاگے۔

پچھلے کنوار کے مہینہ میں سہاگی کی عمر بارہ سال کی تھی۔ چونکہ یہ عقیدہ ہو چلا تھا کہ جفت سال میں شادی نہیں ہونی چاہئے اس کی طرف دھیان نہیں دیا گیا۔ آئندہ سال وہ تیرہ سال کی ہو جائیگی ـــ تیرہ سال، شریف خاندان میں اتنی عمر تک کی لڑکی بن بیاہی کیسے رہ سکتی ہے بھلا۔ گیارہ سال کی عمر ہی سے اس کے والدین اس کو بیاہ دینے کے لئے پریشان تھے۔ لڑکی تھی ماں کی بڑی لاڈلی اور چہیتی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی شادی قریب ہی کسی گھرانے میں طے پا جائے۔ باپ کی بھی یہی خواہش تھی۔ دونوں اس مسئلے پر تو متفق تھے مگر صرف ایک بات پر اختلاف تھا۔ ماں کا خیال تھا لڑکی دور

بیاہی گئی تو ہر وقت اس کے دکھ سکھ کی خبر ملنا مشکل ہے اور نزدیک بیاہی جانے پر بار بار وہ آ بھی سکے گی اور خبر بھی ملتی رہے گی۔ باپ کا خیال تھا کہ دور بیاہی گئی تو پیدل آمد و رفت مشکل ہوگی، پالکی کا خرچ بڑھے گا اور اس طرح خواہ مخواہ جیب ہلکی ہوگی۔

بہر حال فیصلہ یہ ٹھہرا کہ جو بھی ہو شادی قریب ہی کہیں کر دی جائے۔

شریف خاندان کی لڑکی کے لئے بر کی تلاش کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ گاؤں گاؤں اور بھی کتنے شریف خاندان اپنی شرافت کو نباہتے چلے آ رہے ہیں۔ اور جب شریف خاندان میں ایک ہی لڑکی ہو، واحد چشم و چراغ۔ تو پھر اس کی طمع کا کیا کہنا۔

ماں کو اس بات کا بیحد غم تھا کہ لاڈلی بیٹی کی شادی کے موقعہ پر اس کے چاروں لڑکے شریک نہیں ہوں گے۔ لیکن آنسو بہانے اور غم کھانے کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں — بعض لڑکوں کی خبر مل چکی تھی مگر بعض کی نہیں مل سکی تھی — جن کی خبر معلوم تھی ان کو ماں کی طرف سے عاجزانہ خط لکھا گیا۔ لیکن کسی نے جواب تک نہ دیا۔ یہ بات نہیں کہ باپ کا دل غم و اندوہ سے خالی تھا۔ وہ بھی اسے محسوس کر رہا تھا مگر کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ سُہاگی کو گھر پر بیٹھا کر تو رکھا نہیں جا سکتا تھا۔

سہاگی کی شادی کی بات چیت قریب ہی کے گاؤں کے مرزا نور علی کے صاحبزادے کے ساتھ طے پا چکی۔ مبارک مہینہ میں شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔ دونوں کے مکان کا فاصلہ صرف دو میل ہو گا۔ سہاگی ریشمی چولی اور ریشمی ساڑھی زیب تن کر کے زری کا پیچ پیچ کرتا جوتا پہنے شوہر کے گھر آئی۔ اُس کے گلے میں تیس تولہ وزن کا ہار تھا، ۳۵ تولہ کی ہنسلی، دونوں کانوں میں چودہ چودہ بالیاں۔ جُھمکے بھی تھے۔ ناک کی کیل اور نتھ، غرض زیورات کی کمی نہ تھی۔ سر سے لے کر پاؤں تک وہ زیورات سے لدی تھی۔ دو عورتیں سہارا دے کر کمرہ میں نہ لے جائیں تو اُس کی رات وہیں گذرتی۔

گھر کے بزرگ ضعیف ہو چکے تھے۔ سر اور داڑھی کے بالوں میں برائے نام سیاہی رہ گئی تھی۔

ہر جمعہ کو جمعہ کی نماز کے بعد ان کی ڈیوڑھی میں مجلس جمتی تھی۔ وہ دن بھی جمعہ ہی کا تھا۔ حسب معمول بڑے میاں ہاتھ میں حقّہ لیکر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ جو بھی ان کے گھر کے قریب سے گذرتا بڑے میاں اُس کی صلاح کرتے کہ وہ حقہ کا ایک کش ہی لگا جائے لیکن کوئی بھی ان کی درخواست پر کان نہیں دھرتا کیونکہ ہر کسی کو معلوم تھا کہ عصر کے وقت تک مجلس برخاست نہیں ہو گی۔ گفتگو کا موضوع

ہی کچھ ایسا ہوتا تھا کہ بڑے میاں کی زبان چلتی رہتی اور وقت کے گذرنے کا احساس تک نہ ہوتا۔ گفتگو زیادہ تر ان کے خاندانی جاہ و حشم اور شان وشوکت پر ہوتی تھی۔ اتفاق کی بات ان کی تنہائی کو دور کرنے کے لئے عبدل آگیا۔ اس کی خیریت وغیرہ دریافت کرنے کے بعد جب بڑے میاں کو پتہ چلا کہ ہری ہر مہاجن نے اس پر ڈگری دائر کر دی ہے تو انہوں نے حقّے کا ایک کش لے کر ناک اور مُنہ سے دُھواں نکالتے ہوئے کہا ــــ "سب خدا کی قدرت ہے بھائی۔ جس طرح روزانہ دن رات ہوتے رہتے ہیں اسی طرح انسان کی زندگی میں شب و روز آتے ہیں۔ سب زمانہ کی گردش ہے۔ ایک دن ایسا بھی گذرا ہے کہ انگریز تک ہم سے ملنے کے لئے اجازت طلب کرتا تھا۔ میاں عبدل تم تو اس وقت بالکل بچے تھے۔ البتہ تمہارے ابا جان مرحوم کی یہ سب آنکھوں دیکھی باتیں ہیں۔ خدا انہیں جنت نصیب کرے۔ ہم گنہگار رہ گئے یہ دن دیکھنے کے لیے۔" یہ کہہ کر بڑے میاں نے ایک سرد آہ بھری۔

انہوں نے پھر کہنا شروع کیا۔ "تم نے دیکھا نہیں تو سُنا ضرور ہوگا۔ وہ دن بھی کیا دن تھے ــــ چھ سات سال گذرنے کے بعد ہمارے گھر کی لڑکیوں کی کیا مجال کہ کوئی دیکھ لے۔ اس عمر میں بھی لڑکیاں پالکی میں

باہر جاتی تھیں۔ اب وہ دن رات میں بدل چکے ہیں۔ رات نہیں تو کیا ہے کہ اب ہماری لڑکیاں رات کے وقت پیدل برقعے میں باہر جایا کرتی ہیں۔ خدا ہی ہماری عزت وآبرو کا نگہبان ہے۔ اسی لئے تو اس نے مجھے صرف ایک لڑکی دی ۔" بڑے میاں نے پھر ایک لمبی سانس لی۔

سہاگی سسرال گئی اور ڈیڑھ دو ماہ کے بعد پھر میکے آگئی۔ آدھی رات ہو چکی تھی۔ اُس نے برقع لیا اور پازیب کی جھنکار کرتی ہوئی باپ کے گھر اس طرح آئی جیسے ہرکارہ گھنٹی بجا رہا ہو۔ سہاگی کے ابا جان یعنی بڑے میاں دل ہی دل میں بے چینی سی محسوس کرنے لگے ۔

"ساری عزت خاک میں مل گئی۔ جن کے کانوں میں زیورات کی آواز پہنچی ہوگی انہوں نے کیا سوچا ہوگا ۔" یہ سوچ سوچ کر ان کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔

●

کتنے دن آئے اور بیت گئے۔ لیکن میاں بیوی کی محبت میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس کا میاں بیحد شوقین مزاج تھا۔ اس نے سہاگی کو محبّت اور پیار کے لازوال نغمے سنائے۔ سہاگی نے بھی محبّت کا جواب محبّت سے دیا۔ اب وہ گیارہ سال کی بچّی نہ تھی۔ بارہ سے تیرہ، تیرہ سے چودہ غرض اس کی عمر کے دن لمبے ہوتے گئے۔ جس طرح رات کی رانی رات

ہوتے ہوتے کِھل کھلا اُٹھتی ہے۔ سہاگی بھی نازک اندام کلی سے پھول بن چکی تھی۔ اس کا شباب چودھویں کے چاند کی طرح مست و بیخود ہو چکا تھا۔ اس کے روئیں روئیں سے شراب کے قطرے چھلکے پڑتے تھے۔ وہ اپنے آپ میں ایسی مگن تھی کہ اُسے اس کا بھی احساس نہیں ہوتا کہ کون آیا اور کون گیا۔ —— سہاگی کا میاں اپنے آپ کو اس کے فسوں پرور شباب میں کھو چکا تھا تو اس کا کیا قصور ——!

چوری چھپے اس کے لئے پان کی گلوریاں اور مٹھائیاں آنے لگیں۔ رات کے خاموش لمحوں میں دونوں میاں بیوی قصّے کہانی کہتے، ہنستے بولتے۔ گھر بھر دونوں تنہا ہوتے تو "سونا بھان"[۱] کی پوتھی پڑھتے!

سہاگی کے چاروں بھائیوں میں سے ایک بھی اب تک نہیں لوٹا۔ لیکن کبھی کبھی ان میں سے دو ایک لڑکے بوڑھے ماں باپ کے نام کچھ بھیج کر احسان کر بیٹھتے تھے۔

جھوٹ موٹ ماں کی علالت کی خبر پا کر کئی دن ہوئے بڑا بیٹا آیا ہے —— شاید یہ سوچ کر بھی آگیا ہو گا کہ اب بڑے میاں پاؤں میں زنجیر پہنا کر نہیں رکھ سکتے۔

کئی دنوں سے سہاگی کی ماں بیحد پریشان تھی —— سہاگی کو آٹھواں

---

[۱]: بنگالی مقبول عشقیہ کہانی

مہینہ لگ چکا تھا اور پہلے بچّے کی ولادت کا سارا انتظام میکے ہی میں کرنا تھا۔ طے پا چکا تھا کہ سہاگی کا بڑا بھائی جمعہ کے دن اُسے گھر لے آئیگا۔

سہاگی کی ساس اور سسر نے لے جانے پر ناراضی کا اظہار نہیں کیا کیونکہ نزدیک کی تو بات تھی اچھی بُری خبر ہر گھڑی مل سکتی تھی۔ اُس دن سہاگی کی ماں نے مسجد میں شیرینی دی اور کبوتر کا ایک جوڑا مسجد میں اور "قسطنطنیہ درگاہ" میں ایک بکرا بھجوا دیا۔ مسجد کے مؤذن نے کبوتر لے لئے اور جلد ہی دونوں کو حلال بھی کر ڈالا گیا۔ دوسرے دن بازار لگا تو درگاہ کے متولی پندرہ روپے میں بکرا فروخت کر آئے ــــ سہاگی کی ماں نے یہ خیر خیرات اس لئے کی تھی کہ آخوند میاں نے کتاب دیکھ کر کہہ دیا تھا ــــ "یہ نیک کام کر دو تو لڑکی تمام آفتوں سے محفوظ رہے گی۔"

رات کا کھانا ختم کرنے کے بعد سلطان میاں نے کہا۔ "کہئے تو سہاگی کو لانے ابھی چلا جاؤں؟"

بڑے میاں نے تعجب سے جواب دیا۔ "ابھی! ابھی تو راہ گیروں کی آمد و رفت بند بھی نہیں ہوئی ہوگی۔"

بڑے میاں کی بات پتھر کی لکیر ہوتی تھی۔ سلطان خاموش ہوگیا۔ حکم ملا کہ وہ رات کے دو بجے سہاگی کی سسرال جائے ــــ

حکم حاکم مرگ مفاجات والی بات تھی۔

سہاگی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس کے میاں نے کہا — "چار پانچ ماہ سے پہلے تو واپس نہیں آؤ گی — کیوں؟"

سہاگی نے جواب دیا۔ "ہاں بات تو ٹھیک ہے۔ لیکن کم از کم دوسرے تیسرے دن تم ضرور آیا کرنا۔"

"ایسی پابندی تو ممکن نہیں"۔ میاں نے جواب دیا۔

"تو سن لو ہم بھی نہیں آئیں گے۔"

"ہم بھی — یعنی!"

شرم کے مارے سہاگی کے کان کی لویں تک سرخ ہو گئیں۔ اس نے میاں کی گود میں سر رکھ دیا اور آہستہ آہستہ کہنے لگی — "میں اکیلی نہیں ہوں میرے ساتھ —" یہ سنکر اس نے سہاگی کو اپنے سینے سے لگا لیا، اور بے اختیار اس کے گالوں کو بوسے دئے۔ جب سہاگی میاں کی گرفت سے آزاد ہوئی تو بولی — "کل پرسوں ساٹن کے کچھ کپڑے لیتے آنا۔"

"کیوں؟" اس نے پوچھا۔

"بیٹھی بیٹھی ہونے والے بچے کے کپڑے سیوں گی۔" یہ کہہ کر سہاگی شرم کے مارے وہاں سے بھاگ گئی۔

رات کے دو بجے سہاگی بن سنور کر برقع میں باپ کے گھر جائے گی۔

آج پہلی بار نہ جانے کیوں سسرال سے میکے آنے کے لئے اس کے لبوں پر تبسم کی لکیریں نہیں پھیلیں۔ بہت دیر تک تو وہ اپنے میاں سے لپٹ کر روتی رہی۔ میاں کو سہاگی کی اس عجیب حرکت سے تعجب ہُوا۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کا دل بھی کانپ اُٹھا۔ اُس نے دوسرے دن آنے کا وعدہ کیا اور پھر میاں کو پیار کر کے وہ رخصت ہو گئی۔

سلطان نے لالٹین جلانی چاہی تو بڑے میاں غصہ میں آگ بگولہ ہو گئے — "ابے احمق لالٹین جلانے کا وقت ہے یہ؟ اگر کوئی اس وقت بھٹکا ہوا آنکلا تو اس کی نظر لڑکی پر نہیں پڑ جائے گی؟"

سلطان کو بھی غصہ آگیا۔ اُس کو یہ بندھن پسند نہ آئے۔ دیس بدیس کی سیر کرنے کے بعد اس کے خیالات اور ہو گئے تھے۔ وہ اندر ہی اندر کُڑھنے لگا۔ کچھ دُور چلنے کے بعد اس نے آخر کہہ دیا۔ "آدھی رات بِیت چکی ہے اور پھر اتنا گہرا اندھیرا کہ اپنا جسم بھی صاف نظر نہیں آتا۔ لالٹین جلانے میں آخر نقصان کیا ہے؟"

"حرامزادہ، سؤر کا بچہ!" بڑے میاں کا پارہ چڑھ گیا۔ سُلطان سمجھ گیا — "ابّا جان اب تک مکمل طور پر شریف ہیں"۔ اُس نے لالٹین وہیں رکھ دی۔ اور پیچھے مڑ گیا۔

بڑے میاں آگے آگے جا رہے تھے اور سہاگی بیچ میں تھی۔ انہوں

نے سمجھا سلطان پیچھے پیچھے آرہا ہے لیکن سلطان اسٹیشن کا رُخ کر چکا تھا۔

یکایک طوفان کی سی شائیں شائیں آواز سنائی دی۔ اس وقت بڑے میاں کے دماغ میں خیالات کا حشر برپا تھا۔ وہ ان ہی خیالات میں مگن چلے جا رہے تھے۔ سُہاگی بھی بُرقع کے اندر اس آواز کا مطلب سمجھ نہ سکی نہ اندھیرے میں اُسے کچھ نظر ہی آرہا تھا۔ روشنی ہوتی تو شاید دیکھ بھی سکتی۔ سہاگی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ آواز کدھر سے آرہی تھی —— وہ کانپنے لگی لیکن قدم اُٹھتے رہے —— آواز قریب تر آرہی تھی —— اور یکایک شائیں شائیں کرتی ہوئی ایک کار بڑے میاں کے قریب سے گذر گئی۔ موٹر میں لائٹ نہیں تھی۔ پولیس کے خوف سے ڈرائیور پوری رفتار سے چلا رہا تھا۔ بڑے میاں کے حلق سے یکایک چیخ نکل پڑی —— اور ساتھ ہی ساتھ ایک کمزور اور نحیف چیخ نکل کر فضا میں مل گئی —— بڑے میاں نے شور مچایا —"بیٹی سُہاگی" مگر جواب نہ ملا۔ ہر طرف خاموشی طاری تھی، اندھیرا تھا۔ اندھیرے میں بڑے میاں دونوں ہاتھوں سے ٹٹولنے لگے —— شاید سہاگی مل جائے۔ —— مگر جب وہ کچھ دور پیچھے آئے تو اُن کے ہاتھ سے جو چیز مس ہوئی —— وہ خون کے لوتھڑے کے سوا کچھ بھی نہ تھی ؛

ابو رُشد

ترجمہ:- یونس احمر

تین زاویے

خدا نے منعم کو چھپّر پھاڑ کر دولت دی تھی۔ اس کے دوست احباب ٹھیک ہی کہتے ہیں، آج اُس کے پاس جو کچھ ہے سب اُس کے خسر کی بدولت اس نے رشیدہ سے محبت کا سوانگ رچایا تھا محض خسر کی دولت کی طمع میں۔

منعم کے دوست احباب کہیں گے ــــ اس کی محبت کے پیچھے بہت بڑی مصلحت پوشیدہ تھی۔ ممکن ہے وہ یہ بھی کہیں ــــ محبت بھی تو افسرانہ شان کی طرح ایک فیشن ہو چکی ہے۔ ایسی محبت کے پیچھے ہوتی ہے ــــ ساڑی، گھر اور گاڑی کی طمع۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اوّل اوّل رشیدہ کی پرکشش آنکھیں منعم کی آنکھوں میں گھر کر گئی تھیں مگر اس وقت جوانی دیوانی کا نشہ اس کی آنکھوں میں اچھی طرح نہیں جاگا تھا۔

اُس نے صرف ایک خواب دیکھا تھا ـــ میٹھا میٹھا، حسین اور سہانا۔ سونے چاندی اور دولت کا تصوّر تک اُس کے ذہن میں نہیں جاگا تھا۔

رشیدہ کا خیال بالکل جُداگانہ تھا۔ دو ہزاری[۱] باپ کی اکلوتی لاڈلی بیٹی برابر سوچا کرتی کہ اس کو سونے چاندی اور روپے پیسے کے خیال سے نجات کب اور کیسے ملے گی اور جب اس کے بے فکر دل کو اس سے چھٹکارا نہیں ملا تو وہ ایک معمولی ملازمت پیشہ منعم کی طرف مائل ہوگئی اور تب اُس کے دل کے ایک گوشہ میں یہ خیال جاگا کہ منعم کو کس طرح معاشرہ کے اونچے محل میں لایا جائے۔

جب دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے اور وہ بھی دو ہزاری باپ کی بیٹی کے دل میں تو راستہ نکل ہی آتا ہے۔ اس کے باپ سی۔آئی۔ای، کریم صاحب کی آمد و رفت مغل پٹھان کے محلّوں میں تھی۔ اس لئے خواہش کی تکمیل مشکل نہ تھی۔ منعم کی قسمت جاگ اُٹھی۔ شادی سے قبل ہی رشیدہ کے ذہن میں یہ بات سما چکی تھی کہ اس کے بھائی کی تنخواہ پہلے ایک سو تھی، پھر تین سو ہوئی، تین سو سے سات سو اور سات سو سے بڑھتے بڑھتے ساڑھے آٹھ سو ہوگئی اور اس طرح وہ معاشرہ کی بلند ترین سیڑھی پر پہنچ گیا۔

۱؎ غیر منقسم ہندوستان کے وقت کا خطاب۔

منعم کے چہرہ میں کوئی کشش ہو یا نہ ہو، تھا بڑا ہی محنتی اور جفاکش اور اس کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ تھی کہ اچھی صحت کے ساتھ اس کے چہرہ پر کافی رونق بھی آگئی تھی۔ اسی اثنار میں اس نے چٹگاؤں کے مشہور درزی برکت علی کی دکان سے تین سُوٹ سلوائے اور ٹائی اور جوتے کلکتہ سے منگوائے۔ مگر جب وہ "سی۔ آئی۔ ای" صاحب کے ڈرائنگ روم میں دولہا بن کر آیا تو نہ جانے کیوں ان کے دل کو ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی۔

اور جب اس طرح دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے تو دولہا دلہن کو "پہلی ملاقات" کی خوشی سے کہیں زیادہ خوشی تحفے تحائف اور زیور گہنے دیکھ کر ہوئی۔ مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شادی کی رسوم ختم ہونے کے بعد جب رات کا پچھلا پہر آیا اور رشیدہ نے کھڑکی کے باہر نیم کے درخت کے اوپر مسکراتے ہوئے تاروں کو دیکھا تو اُسے نصف کٹا ہوا چاند نظر نہ آیا یا جب بنارسی ساڑی میں زیب تن نئی نویلی دلہن پر منعم کی ترچھی نگاہ پڑی تو چار سال پہلے کی جانی پہچانی شکل پُر اسرار معلوم ہوئی۔

ساڑی کا مسئلہ تو شادی کے بعد ہی حل ہو گیا تھا۔ درجنوں اچھی اور قیمتی ساڑیاں جمع ہو چکی تھیں بالکل اس طرح جیسے نادار النسانوں کے گھروں میں بچوں کی ریل پیل ہوتی ہے۔ ساڑی پا کر جس طرح رشیدہ

پھولے نہیں سماتی تھی، ساڑی دیتے وقت منعم کو بھی ایک عجیب سا سکون محسوس ہوتا تھا۔

لیکن اپنا گھر بنتے بنتے ذرا دیر ہو گئی۔ اس تاخیر کا سبب خود رشیدہ ہے کیونکہ وہ فیصلہ نہیں کر پاتی تھی کہ گھر اور گاڑی میں سے زیادہ ضرورت کس چیز کی ہے۔ اس سوال پر شادی کے چند ہی مہینے بعد میاں بیوی کے درمیان کانفرنس ہوئی اور اس کانفرنس میں آخرکار طے یہ پایا کہ گاڑی خریدنے سے پہلے مکان تعمیر کرنا ضروری ہے۔ ''سی۔ آئی۔ ای'' صاحب کی دولت، ملازمت اور پرمٹ کی مدد سے جب منعم کی دلی خواہش پوری ہونے کو آئی تو ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ اس کی وجہ سے اس کے دل کو ٹھیس بھی لگی اور دو ایک دن کے لئے وہ ذہنی پریشانی میں مبتلا رہا ـــــ اس کے زمانۂ طالب علمی کے ایک ساتھی شاہد علی نے خط لکھا تھا۔ دونوں کی زندگی میں ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے جب نوجوانی کے نشے میں اُن سے طرح طرح کی حماقتیں سرزد ہوئیں۔ دونوں ہوسٹل میں ساتھ رہتے تھے اور فرصت کے اوقات میں اس قسم کی بازی بدتی کہ فلاں مشہور گلی میں فلاں شریف اور قابلِ عزت پروفیسر ضرور ملیں گے۔ اس شرط کے تحت دونوں اس گلی کی سیر کرتے اور کبھی کبھی موقع مصلحت پا کر دونوں اپنی تشنگی بھی دور کر لیتے اور جب شاہد اس بات

پر غور کرتا کہ اگر پروفیسر صاحب نے انہیں دیکھ لیا اور جواب طلب کیا تو وہ کیا کہیں گے۔ اس پر منعم اکڑ کر کہتا ــــ "ابے جا، وہ پوچھیں گے کیا۔ اور اگر میں ہی اُن سے یہ دریافت کر بیٹھوں کہ جناب بتایئے آپ یہاں کیا کر رہے ہیں تو ان سے کیا جواب بن پڑے گا!"

ایک دن کا ذکر ہے دونوں ایک بڑے رسیتوران میں گئے شاہد کی نگاہ یکایک کچھ پرے ایک برق پارہ پر پڑ گئی لیکن اسکی فسوں پرور نگاہیں نہ تو شاہد ہی کی طرف متوجّہ ہوتیں اور نہ منعم کی طرف۔ اس کے باوجود لُطف کی بات یہ ہے کہ شاہد نے محسوس کیا ــــ "اُس برق پارہ نے میری طرف ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی ہے"، اور منعم نے سوچا "اُس نے مجھے اپنی خاموش محبّت کا پیغام دیا ہے"۔ رسیتوراں سے باہر نکل کر منعم نے کہا ــــ "دیکھو شاہد وہ لڑکی تمہیں اس طرح گھُور رہی ہے جیسے نِگل ہی جاتی"۔ شاہد نے جواب دیا ــــ "مگر میں کوئی چھوٹی سی مچھلی تو نہ تھا"۔

ان باتوں کو گذرے ہوئے ایک جُگ بیت چکا ہے۔ اب نہ وہ دن اور نہ وہ راتیں۔ اب تو وہ پُرانی یادیں قیمتی اور باریک ساڑیوں اور گھر کی آرزؤں میں دب کر رہ گئی ہیں۔ اب منعم کا دل پچھلی یادوں کی قبر بن چکا ہے۔

شاہد نے منعم سے کچھ روپے مانگے تھے۔ اس نے خط میں لکھا تھا کہ بیوی بیمار ہے اور خود ان دنوں مالی مشکلات کے شکنجے میں بُری طرح جکڑا ہوا ہے۔ اگر سو پچاس روپے کا انتظام ہو جائے تو بہت حد تک اس کی پریشانیاں دُور ہو جائیں گی۔ روپے کا یہ مطالبہ منعم کو بہت گراں گذرا۔ اُس نے بُرا محسوس کیا۔ کیونکہ امیروں کی دنیا میں غریب و نادار شوہر کی بیوی کے علیل ہونے کی خبر پر کسی کو کیسے یقین آسکتا ہے؟

منعم نے رشیدہ سے مشورہ کر کے جواب میں یہ لکھ بھیجا کہ مکان کی تیاری میں کافی پیسے خرچ ہو چکے ہیں۔ سو روپے دینا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔ لیکن بیگم شاہد کو شفا ہو جائے تو دو ایک دن کے لئے غریب خانہ پر ضرور تشریف لانا۔ بہت خوشی ہوگی۔

لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ منعم اپنے دوست اور اس کی بیوی کی یاد کو بھلا نہ سکا۔ ایک دن وہ ڈویژنل فارسٹ آفیسر کے پاس گیا تھا۔ اُسے یہ معلوم کرنا تھا کہ ساگوان کا ایک درخت کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مگر باتوں باتوں میں شاہد کی بیوی کی یاد تازہ ہو گئی۔ اُس کا رنگ سانولا تھا مگر تھی بیحد نازک اندام اور ہنس مُکھ ــــــ آنکھوں کے لئے دعوتِ دید! اُسے یاد آیا کہ جب شاہد اُسے بیاہ کے لایا

تھا اور منعم کی پہلی نظر اُس پر پڑی تھی تو اُس کا دل حُسنِ سادہ کی طرف بے اختیار کھنچ گیا تھا۔ اب اُسے محسوس ہوا کہ اس ہنس مُکھ، سانولی اور سادہ لیکن پُر کشش حُسن والی دوشیزہ کے سامنے اُس کی رشیدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اُسے اب ایسا کیوں محسوس ہوا؟ —— اس سوال کا جواب اُس کے پاس نہیں تھا۔ اُسے خود بھی نہ معلوم ہو سکا کہ شاہد کی بیوی نے اس کے دل و دماغ میں رشیدہ کی تصویر کی بجائے اپنی تصویر کیوں آویزاں کر دی۔

فارسٹ آفیسر کے بنگلہ سے جب منعم اپنے گھر گیا تو سب سے پہلے رشیدہ پر نظر پڑی۔ اُس نے بھرپور نگاہوں سے اس کو دیکھا — اس کے چہرے پر اب بھی جوانی کی چھایا تھی لیکن نزاکت و نرمی نہیں تھی۔ اور یکایک ایک لمحہ کے لئے منعم کے دل میں یہ سوال جاگا کہ کیا اس نے رشیدہ سے واقعی محبّت کی تھی؟ کیا اس کی محبّت میں صرف اس کی شوخیوں، قہقہوں اور انگریزی مکالموں کو دخل تھا۔ یا یہ اس کی دولت تھی جس نے اس کو اس سے محبّت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یا پھر کچھ اور؟ جب کچھ دیر تک منعم رشیدہ کو دیکھتا رہا تو اُس نے تاڑتے ہوئے پوچھا —— "آخر کیا دیکھ رہے ہو اتنے غور سے؟"

"نہیں، کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔" منعم کی آواز حلق میں اٹک کر

رہ گئی۔

اور جب شام کو اس نے پولیس والے ایک دوست کے گھر دعوت میں جانے کی تیاری کی تو میک اپ کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ وہ بار بار بیوی کی ساڑی اور بلوز کی طرف دیکھتا تھا ــــ وہ چاہتا تھا کہ ساڑی اور بلوز کا رنگ ایسا ہو کہ بُرا نہ معلوم ہو۔ وہ اپنے دل کو اس بات کا بھی یقین دلا رہا تھا کہ اس کے گلے کے ہار اور نئے سینڈل کتنے خوبصورت ہیں۔

●

ایک دن ایسا آیا کہ میاں بیوی مکان کے مالک بھی بن گئے۔ اس مکان کی تعمیر میں دونوں نے جان توڑ محنت کی تھی۔ یہی سبب ہے کہ مکان تعمیر ہو جانے کے بعد رشیدہ نے بڑے فخریہ انداز میں اس کی طرف دیکھا اور معاً اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ــــ "زیادہ خوبصورت کون ہے ــــ مکان یا منعم" منعم نے بھی کم و بیش ایسا ہی سوچا ــــ "میری نظروں میں زیادہ قیمتی شے مکان ہے یا رشیدہ" اس کے بعد دونوں کے ذہن میں یہ خیال بھی پیدا ہوا "سب کچھ تو ہوا، اب صرف ایک بچہ چاہیے، جس پر دونوں فخر کر سکیں"۔

رشیدہ تنہائی میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ ایک بچہ یا بچی کے بغیر زندگی بے کیف ہے۔ ساڑیاں ملیں، مکان بھی ہوا اور اب گاڑی کی

ضرورت سے کہیں زیادہ ضرورت بچّہ کی ہے۔ اور یہ خیال اس کے ذہن میں دو وجوہات سے پیدا ہوا تھا۔ بچّہ نہ ہوا تو گھر کی زندگی مکمل نہیں ہو سکتی اور اس طرح منعم کو سخت اور مضبوط بندھن میں جکڑا نہیں جا سکتا۔ دوسرے منعم اب کبھی کبھی اُس سے ناراضگی کا اظہار کرنے لگا تھا۔ اتنے دھن دولت، اتنے آرام و عیش اور اتنی بڑی عمارت کے باوجود اس کی زندگی میں ایک خلا رتھا جس کی چُبھن سے رشیدہ تلملا اُٹھتی تھی۔

دو ایک ماہ بعد جب رشیدہ نے بچّہ اور گاڑی کے لئے کچھ پیسے جمع کر لئے تو ایک دن ٹاؤن راشننگ آفیسر کے گھر میں ان کی دعوت ہوئی۔ منعم اور رشیدہ وہاں پہنچے ہی تھے کہ یکایک منعم کی نگاہ اپنے پُرانے ساتھی شاہد اور بیگم شاہد پر پڑ گئی۔ اُسے نہ صرف تعجب ہوا بلکہ ذہنی پریشانی بھی ہوئی۔ بعد میں دوست کی زبانی معلوم ہوا کہ شاہد سب ڈپٹی بن کر یہاں آیا ہے۔ یہ سُن کر منعم نے شاہد سے کہا ـــ "تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں یہاں ہوں۔ تعجب ہے تم نے اپنی آمد کی اطلاع تک نہ دی!"

شاہد نے نہایت شریفانہ انداز میں جواب دیا۔" بڑی عجلت میں آنا ہوا ہے۔ اطّلاع دینے کا وقت تک نہ ملا۔" اس کے بعد باتوں باتوں میں منعم کو پتہ چلا کہ شاہد کو اب تک مکان نہیں ملا ہے اس لئے وہ اپنے ایک پروفیسر دوست کے یہاں ایک کمرہ میں کسی نہ کسی طرح بسر کر رہا ہے۔

منعم نے ازراہِ ہمدردی کہا۔" میرے غریب خانہ کو بھول کیوں گئے۔ معلوم ہوتا ہے مجھے بالکل فراموش کر دیا تم نے۔"

شاہد ہنسنے لگا۔" ارے بھئی فراموش کیوں کروں گا۔ دوست کو بھی کہیں بھلایا جا سکتا ہے۔"

شاہد کے ان الفاظ میں منعم نے طنز محسوس کیا۔

کچھ دیر تک منعم بیگم شاہد کی طرف ترچھی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کبھی علیل ضرور تھی کیونکہ وہ پہلا سا نکھار نہیں تھا۔

رشیدہ کو محسوس ہوا کہ منعم بیگم شاہد کی طرف کبھی کبھی دیکھ لیتا ہے۔اس کا دل کانپ اٹھا۔اس نے سوچا— اس کا اپنا مکان ہے، اتنی قیمتی ساڑیاں ہیں اس کے پاس، اور پھر گاڑی خریدنے کی آرزو بھی ہے دل میں — کیا ان چیزوں کی کوئی قیمت نہیں۔کیا منعم نے صرف ان ہی چیزوں کے لئے اس سے شادی نہ رچائی تھی؟ کیا اس کے دل میں کوئی اور مقصد کام کر رہا تھا؟ آخر اس کے اندر کس چیز کی کمی ہے؟ ساڑھے تین سو تنخواہ پانے والے سب ڈپٹی کی بیگم کی طرف بار بار گھورنا — اس کے پیچھے یقیناً کوئی پُر اسرار واقعہ ہے۔اس کی ساڑی پندرہ روپے سے زیادہ کی نہیں ہوگی،اس کے باوجود منعم کی چاہت — رشیدہ

کا سر چکرانے لگا۔

محفل ختم ہوئی تو منعم نے اپنے دوست سے کہا۔ "آئندہ اتوار کو میرے یہاں دعوت رہی۔" اور پھر ذرا مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے اُس نے شاہد کی بیوی سے کہا۔ "آپ بھی آرہی ہیں نا؟" بیگم منعم نے بھی لبوں پر تبسم لاتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے جب تک آپ لوگوں کو مکان کی تکلیف ہے ہمارے غریب خانے پر تشریف لے آیئے۔" اور پھر وہ منعم کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟" منعم نے جیسے کچھ چھپاتے ہوئے کہا۔ "اس سے زیادہ میں اور کیا کہوں گا۔ یہ میاں بیوی ہمارے غریب خانہ پر تشریف لے آئیں تو ہم اپنے کو خوش قسمت سمجھیں گے۔"

شاہد نے بڑے تکلف کے انداز میں کہا۔ "دیکھئے نا ہمارے پروفیسر دوست کسی صورت میں نہیں چھوڑیں گے۔ معذرت چاہتا ہوں۔"

رشیدہ نے شاہد کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی تو آپ کے دوست ہیں۔ میرا خیال ہے آپ چاہیں تو......؟" اور پھر اس نے بیگم شاہد کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کیا خیال ہے آپ کا؟" مگر بیگم شاہد صرف مسکرا کر رہ گئیں۔

جاتے وقت منعم نے شاہد سے کہا۔ "اتوار کو ٹھیک سات بجے گاڑی بھیج دوں گا۔" پھر اس نے بیگم شاہد سے کہا۔ "دیکھئے آپ کو آنا ہے۔"

ایک دوست کی مانگی ہوئی جیپ گاڑی پر جب دونوں جانے لگے تو رشیدہ نے منعم سے کہا۔ "تم نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ گاڑی بھیجدوں گا مگر گاڑی ہے کہاں؟" منعم نے نہایت ہی لاپروائی سے جواب دیا۔

"ارے بھئی گاڑی نہیں ہے تو کیا ہوا۔ تم کیوں پریشان ہو؟"

اپنے سوال کا یہ جواب سُن کر رشیدہ کو دُکھ ہوا۔ اس نے صرف اتنا کہا۔ "تو کیا میرے سوال کا یہی جواب ہو سکتا تھا؟"

اس کے بعد راستہ بھر دونوں میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔

●

سنیچر کے دن سویرے سویرے منعم نے رشیدہ سے کہا: "سُنو ایک خوش خبری ہے تمہارے لئے ۸۰ء ماڈل کی ایک آسٹن مل رہی ہے۔ دیکھوگی؟"

رشیدہ نے اس پر کچھ غور نہیں کیا۔ صرف منعم سے اتنا کہا۔ "چلو دیکھ آئیں۔"

گاڑی ایک صاحب کی تھی۔ وہ اپنے وطن واپس جارہے تھے اس لئے گاڑی فروخت کرنے کی نوبت آئی۔ معلوم ہوا کہ گاڑی صرف پندرہ ہزار میل چلی ہے، انجن درست ہے اور قیمت صرف پانچ ہزار روپے۔ دو تین دن آزمائش کے لئے گاڑی ان ہی کے قبضے میں رہے گی۔

دونوں نے پسند کر لیا۔ طے پایا کہ تین دن آزمائش کر لی جائے۔ اچھی ثابت ہوئی تو پانچ ہزار میں سودا گراں نہیں پڑے گا۔

دونوں اس بات سے بیحد خوش ہوئے کہ چلو کم ازکم تین دن تک تو گاڑی ان کے قبضے میں رہے گی اور پھر کل ہی شاہد اپنی بیگم کے ساتھ دعوت پر آ رہے ہیں، یہ گاڑی کام آجائے گی۔ اسے دیکھ کر دونوں میاں بیوی سوچیں گے کہ منعم کے پاس گاڑی بھی ہے، مکان بھی ہے اور قیمتی سے قیمتی ساڑیاں بھی۔

اتوار کی شام آگئی۔ لیکن گاڑی اسٹارٹ نہ ہو سکی۔ ہزاروں کوششوں کے باوجود منعم کو جب ناکامی ہوئی تو اس کا دم پھول رہا تھا۔ اس نے سوچا ـــ اب کیا ہوگا؟ رشیدہ نے بھی ندامت محسوس کی۔ اُس نے مشورہ دیا۔ "اپنے پولیس انسپکٹر دوست کو فون کرلو۔ ان کے پاس دو دو جیپ کاریں ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے ایک ضرور دے دیں گے۔"

پولیس انسپکٹر کو فون کیا گیا۔ اس نے جیپ بھیج دی۔

لیکن منعم کے دل کو خوشی نہ ہوئی۔ رشیدہ نے اس کی پریشانی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔ "جیپ میں کوئی تکلیف ہو گی کیا؟" منعم نے جواب دیا۔ "پرائی گاڑی اپنی نہیں ہو سکتی رشیدہ!"

رشیدہ بولی۔ "بھئی اس میں رنجیدہ ہونے کی کیا بات ہے۔ جب مہمان ہی پرائے ہیں تو پرائی گاڑی سے کیا نقصان ہو جائے گا؟"

رشیدہ کے ان چبھتے ہوئے الفاظ نے تھوڑی دیر کے لئے منعم کو

جھنجھوڑ ڈالا لیکن اس نے فوراً اپنے آپ کو قابو میں لاتے ہوئے کہا۔ "تعجب ہے آج تمہارے مُنہ سے ایسی خفیف بات کیوں نکل گئی رشیدہ؟"

رشیدہ نے اس کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ خاموش رہی۔

جیپ آگئی اور منعم اسے لے کر روانہ ہوگیا۔ اس نے رشیدہ سے بھی چلنے کے لئے کہا تھا لیکن مصروفیت کا بہانہ کر دیا اور جانے سے معذوری ظاہر کی۔ منعم کی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر رشیدہ کی مصروفیات کیا ہیں۔ باورچی خانہ کا کام وہ نہیں کرتی۔ گھر کی صفائی نوکروں کے ذمّہ ہے۔ پھر کون سا ایسا کام سر پر آن پڑا کہ اُس نے جانے سے انکار کر دیا؟

بہت دن کے بعد منعم نے اپنے دل کے اندر جھانکا۔ اس نے ضرورت کے وقت دوست کو پانچ سو روپے نہیں دیئے تھے — اس انکار نے نہ صرف شاہد کو ذہنی تکلیف پہنچائی ہے، اس کی بیوی کو بھی اس کا بیحد افسوس ہے۔ منعم نے محسوس کیا کہ اس کی نرم اور مشفقانہ باتیں شاہد کے دل کے گھاؤ پر مرہم نہیں رکھ سکتیں۔ یہ خیال منعم کے لئے تازیانہ بن چکا تھا۔ اب جب بھی شاہد سے مڈبھیڑ ہوتی وہ واقعہ اسے کچوکے دینا شروع کر دیتا ہے۔ دعوت دینے کا بھی اصل مقصد یہ ہے کہ منعم جاننا چاہتا تھا کہ کیا اب بھی اس کے دل میں کدورت باقی ہے۔

منعم کئی دنوں سے اس بات کو محسوس کر رہا تھا کہ شاہد اور بیگم شاہد اسے اور

رشیدہ کو زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے چھوڑ چکے ہیں۔ لیکن وہ آج یہ ثابت کر دینا چاہتا تھا کہ اس دوڑ میں شکست اور فتح کس کو ہوگی۔

منعم شاہد کے گھر پر پہنچا۔ شاہد اُسے اپنے کمرہ میں لے آیا۔ کمرہ میں داخل ہوتے ہی اُس نے چاروں طرف بڑی سادگی پائی۔ کوئی سجاوٹ نہیں، کوئی فیشن نہیں۔ ایک تخت، تین چار عدد بید کی کرسیاں، بید کی ایک شکستہ سی میز۔ کمرہ کے ایک گوشہ میں معمولی سی سا آلنا اور اس پر قمیصیں ساڑیاں، موزے وغیرہ لٹکے ہوئے۔

منعم کے آنے سے پہلے شاید دونوں میاں بیوی قلبی اطمینان اور ذہنی سکون کی باتیں کر رہے تھے۔ بیگم شاہد نے کہا "آپ کے لئے تھوڑا سا شربت لے آؤں"۔ یہ کہہ کر وہ کمرہ سے باہر نکل گئی۔ آج بہت دنوں کے بعد منعم اور شاہد تنہا ملے تھے۔ موقع غنیمت جان کر منعم نے ندامت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "اس بات کا تمہیں دُکھ ضرور ہوگا کہ ضرورت کے وقت تمہیں پانچ سو روپے نہ دے سکا"۔

"ارے لاحول ولا۔ بھئی تمہارے پاس پیسے نہ تھے تو کہاں سے دیتے"۔

منعم کو اب بھی یقین تھا کہ شاہد نے اس کے انکار کو ضرور محسوس کیا ہے۔ اس لئے اس نے پھر کہا "ممکن ہے تمہیں یقین نہ آیا ہو۔ تم نے

سمجھا کہ جو دوست گھر بنا سکتا ہے وہ ایک دوست کی ضرورت کیسے پوری نہیں کر سکے گا ؟"

" ارے بھئی چھوڑو ان باتوں کو۔ جب ضرورت تھی طلب کیا۔ اب تو ضرورت نہیں ہے۔ پچھلی باتوں کو چھیڑنے سے کیا حاصل ؟"

شاہد کی بیوی گلاس میں شربت لے آئی۔ اس نے گلاس کو میز پر رکھ کر ہنستے ہوئے کہا ۔" آپ کی تواضع اچھی طرح نہ کرنے کا افسوس ہے۔ افسوس ہے اس وقت یہی حاضر ہو سکا ۔"

شاہد کی گفتگو سن کر منعم کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے ایک ایک لفظ میں استہزا ہے۔ لیکن بیگم شاہد کے ہنس مکھ چہرے سے اس کی مہمان نوازی اور شیریں کلامی سے منعم کا شک دور ہو گیا۔ شاہد اور بیگم شاہد کی پُرسکون زندگی سے اس بات کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے مطمئن ہیں۔ ان کی زندگی میں کہیں کوئی خلا نہیں ہے، کوئی تنازعہ، کوئی جھگڑا کسی قسم کی عداوت نہیں۔

منعم دونوں میاں بیوی کو لے کر اپنے مکان پر پہنچ گیا۔ ڈرائنگ روم کو خاص طور پر سجایا گیا تھا۔ دونوں وہیں بٹھائے گئے۔ رشیدہ نے خوب میک اپ کر رکھا تھا۔ منعم نے بیگم شاہد کو اور پھر رشیدہ کو دیکھا ـــــ دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ بیگم شاہد مرشد آبادی ساڑی

میں ملبوس تھی۔ گلے میں معمولی سا ہار تھا اور ہاتھوں میں سونے کی چند چوڑیاں تھیں۔ رشیدہ نے بیگم شاہد کی ان چیزوں کو دیکھا تو اس کا سر غرور سے اور اونچا ہو گیا۔ دونوں میں کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر اس کا پندار اور بڑھ گیا جب اس نے محسوس کیا کہ دونوں میاں بیوی اس کے ڈرائنگ رُوم کا بار بار جائزہ لے رہے ہیں۔ لیکن فوراً ہی اسکے اس پندار کو ایک جھٹکا سا لگا۔ جب اس نے دیکھا کہ ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے کے بعد دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کے کان میں کچھ کہا۔ اگرچہ رشیدہ ان کی باتوں کو سُن نہ سکی مگر اس نے اندازہ لگا لیا کہ ضرور دونوں کو ڈرائنگ روم میں کہیں کوئی نقص نظر آیا ہے۔ اس دکھ سے کہیں زیادہ دکھ اس کو اس بات کا ہوا کہ منعم بار بار بیگم شاہد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل کی مسرّتوں کا لہلہاتا ہوا چمن ویران ہو گیا۔ رشیدہ کی سمجھ میں اب اچھی طرح آنے لگا کہ شاہد کے ساتھ ملاقات ہونے کے بعد سے منعم بیگم شاہد اور اس کے ساتھ برابر مقابلہ کرتا رہا ہے اور ہر مقابلہ میں رشیدہ ہی کو شکست ہوئی ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ وہ حسین نہ سہی مگر بدصورت بھی تو نہیں۔ کالج کے زمانہ میں بہتوں نے اس سے محبّت کرنے کی کوشش کی تھی اور پھر منعم نے بھی تو اُس سے بے پناہ محبّت کی تھی —— اُسی

بے پناہ محبت کا نتیجہ یہ شادی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس نے اپنا مکان تعمیر کرایا۔ بہت سے دوست احباب پیدا ہوئے۔ سوسائٹی میں قدر و منزلت بڑھی۔ دو ایک دن کے اندر اپنی گاڑی بھی ہو جائے گی ــــ اس کے باوجود منعم پانچ سال کے بعد ایک دوست کی بیوی کی طرف اتنی بُری طرح مائل کیوں ہے ــــ آخر کیوں؟

یکایک اُس کا دل بے چین ہو اُٹھا اور سینے کے اندر کوہ آتش فشاں کا لاوا برسنے لگا۔ اُسے محسوس ہوا ــ شیفون کی یہ ہلکے رنگ کی ساڑی اُسے ڈنک مار رہی ہے۔ کانوں کے آویزے اُسے کاٹے کھا رہے ہیں، اور یہ کار جسے وہ خریدنے کا ارادہ رکھتی ہے شاید کبھی اسٹارٹ ہی نہ ہو۔ رشیدہ کو اس پر بھی کوئی حیرت نہ ہوئی کہ اس کے شکم میں جو بچّہ ان دنوں اس کے جسم کا خون چُوس رہا ہے۔ بڑا ہو کر وہ بھی منعم کی طرح دھوکا نہ دے ــ اور اس طرح ایک دن اُس کی زندگی ہی اُس سے بے وفائی کر بیٹھے۔

بیرے نے آکر کہا ــ "میم صاحب کھانا چُن دیا گیا"

اور وہ دل میں غم و اندوہ کا طوفان لے کر لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے اپنے مہمان سے بولی ــ "چلیئے کھانا تیار ہے ــ"

●

شوکت عثمان

ترجمہ: عبدالرحمٰن بیخود

گُل نیلوفر

گاؤں کے اس جانب لوگوں کی آمد و رفت نہیں ہے۔ ایک پتلا سا نالا ہے جو جیٹھ کے مہینہ میں تو سُوکھ جاتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں تھوڑا تھوڑا پانی باقی رہ جاتا ہے۔ اور اس پر بے شمار پڑا پھُول کھِل جاتے ہیں۔ سانپ اور سنپولئے دن دوپہر یہاں کی دھوپ کھایا کرتے ہیں اور شاید اسی وجہ سے یہاں کے پھُولوں کو ہاتھ لگانے کی کوئی ہمت نہیں کرتا۔ اور وہ نڈر ہو کر لہلہایا کرتے ہیں۔ اس بن کی دیوی کی حسین لڑکیاں آپ ہی آپ مسکراتی ہیں کھِلتی ہیں۔ اور پھر مسکرا کر ابدی نیند سو جاتی ہیں۔

اس سال گرمی نے کچھ غیر معمولی تیزی اختیار کر لی تھی اور بہت دنوں سے جنگل کی زبان بھی اوس چاٹ رہی تھی۔ اسی لئے اس سال

معلوم دیتا تھا کہ اس نالے میں پانی بالکل ہی نہ تھا۔ بس صرف ایک جگہ پر تقریباً دس ہاتھ لمبا چوڑا ایک گڑھا تھا جس میں کچھ کیچڑ سی باقی رہ گئی تھی۔ اور صرف دو پدّا پھول اس میں کھلے ہوئے تھے۔ اگنی دیوتا کی مہربانی تو ایسی ہی تھی کہ پورا نالا سوکھ جاتا مگر اب چند دنوں کی بارش سے یہ کیفیت ہو گئی ہے کہ جیسے گاؤں والوں کے لئے ایک سیلاب آ گیا ہو۔ کسانوں کی پژمردگی دور ہو گئی ہے اور پدّا پھول کی سوکھی ہوئی شاخیں پھر ہری ہو رہی ہیں۔ اب سیلابی کیفیت تو کم ہو گئی ہے اور سرسبزی اور جابجا گڑھوں میں پانی اب بھی باقی ہے۔ جہاں ہر طرف جلی ہوئی گھاس اور بالو کے ڈھیر نظر آ رہے تھے۔ اب وہاں ہر طرف سرسبزی اور شادابی ہے۔ زمین پر سبز مخملی قالین اور آسمان پر چھوٹے چھوٹے ابر کے ٹکڑوں کا شامیانہ اور اس پر اڑتے ہوئے پرندوں کی جھالر سی کتنی حسین معلوم ہوتی ہے۔

یہ سب شاید انہی دو پدّا پھولوں کی خوش نصیبی کا ثمرہ تھا ورنہ اس طرح بے وقت بارش ذرا کم دیکھی گئی ہے۔ پانی کی سطح پر ایک سنہری پپڑی سی جمی ہوئی ہے۔ اس پر سر نکالے ہوئے یہ دو پھول سورج مہاراج کا درشن کیا کرتے ہیں۔ شام ہوتے ہی چڑیاں اپنا راگ الاپتی ہوئی اپنے اپنے گھروں کو جاتی ہیں شام

کی لہرا دینے والی ہواؤں میں جنگل کی دیوی کے یہ دو بچّے آپس میں سرگوشیاں کیا کرتے ہیں۔ اسے کوئی کیا جانے۔

فطرت اس چھوٹے سے نالے پر کالی رات کا پردہ ڈال کر صبح تاباں کی طرف آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہی ہے۔ بس وہی دو پھول اپنا سر اُٹھائے ہوئے ہیں۔ کسی اور کا چہرہ نظر نہیں آتا۔ پانی کی سطح پر شاید رات کی شبنم، شبنم کیوں آنسوؤں کے قطرے، جو انہی پھولوں کی آنکھوں سے بہے ہیں۔ یہ قطرے صبح کی سپیدی میں ڈوبتے ہوئے ستاروں کی طرح جھلملا رہے ہیں۔

اب اس نالے میں اتھاہ پانی ہے۔ رات کو بیوپاریوں کی پان سُپاری سے لدی ہوئی کشتیاں دُھندلا دُھندلا چراغ جلائے ہوئے اسی نالے سے گزر چکی ہیں۔ وہ جس گاؤں تک گئی ہیں وہ گاؤں بھی یہاں سے دُور نہیں۔ جگہ جگہ چڑیوں کا غول اس پتلے سے نالے میں خوشی کا پیغام سُنا رہا ہے۔ ساون بھادوں کے مہینے میں یہ جھُنڈ ایک بڑی فوج میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس وقت تو ہر طرف صرف پانی ہی پانی نظر آیا کرتا ہے۔

اس دن بھی رات نے اپنے گیسو پھیلا دئے تھے۔ تاریکی کا ہر طرف دَور دورہ تھا۔ ٹمٹماتے ہوئے چراغ جلا کر چھوٹی چھوٹی کشتیاں گزر گئی تھیں۔ نالے کے پانی میں تلاطم پیدا ہوا تھا۔ اور وہ دونوں بے کس پھول

اپنی جان بچانے کے لئے پانی میں ایک طرف کھسک گئے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا تھا — "کیا آخری کشتی تھی؟ اس میں کون تھا؟" جواب ملا — "ایک لڑکی!"

— "کوئی دُلہن؟"

"ہاں!"

بھُول ذرا تھم گیا۔ پانی میں کچھ سکون آگیا۔ سطح کے اُوپر کی پتیاں اب تک لرز رہی تھیں۔ اندھیرے میں کچھ اور نظر نہ آتا تھا۔ ایک ذرا غمگین دل سے ایک پھول نے پوچھا — "وہ روتی کیوں تھی؟"

"دلہن ابھی تو بچہ ہی تھی نا۔ یا اپنے شوہر کے گھر جا رہی ہے اسی لئے!"

"کیا اُس کے شوہر نے اُسے کچھ بُرا بھلا کہا تھا؟"

بظاہر تو اس کا شوہر کوئی اچھا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ مگر دُلہن تو بالکل تمہاری ہی جیسی تھی!"

رات کے اندھیرے میں کسی کو کیا معلوم کہ یہ پانی میں تیرنے والے بے زبان جاندار بھی اپنے دلی جذبات ظاہر کرتے ہیں۔

اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ دونوں ساتھی پانی ہی کی سطح پر نیند کے مزے لے رہے ہیں۔ آنکھ کھُلی تو بہت رات گذر چکی تھی۔ مہینے کے تاریک حصے کا بیمار چاند دم توڑتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ پھر بھی اس

دھندلکے میں آنکھیں مَل مَل کر آس پاس نظر دوڑانے کو جی چاہتا ہے۔
جی چاہتا ہے ان چڑیوں کے دیکھنے کو جو رات کے وقت اپنا پیٹ بھرنے کے لئے چپُ چاپ ندّی نالوں میں اپنے شکار پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ دنیا کی ایسی ہی بہت سی چیزوں کے نظاروں کا شوق آنکھیں کھول دیتا ہے ــــ جب آخر رات کا بوڑھا چاند اپنی کمر جھُکائے ہوئے نکلتا ہے اور اس کی پھیکی چاندنی آس پاس کے درختوں پر ہلکا ہلکا سایہ ڈالتی ہے۔ اس وقت کی فضا لاجونتیوں میں بھی انگڑائیاں لینے کا جذبہ پیدا کر دیتی ہے۔

یہ بوڑھا چاند تھوڑی ہی دیر میں گاؤں کے اس پار جا کر ڈوب جائے گا۔ ایک پھُول دوسرے کے مُنہ کی طرف شوق بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہ ہلکی ہلکی روشنی کے سایہ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے تکتا رہا۔ اس کے ہونٹوں کی ہنسی بھی جیسے چاند ہی کے ساتھ ساتھ ڈوبتی جا رہی ہے۔ آخر اس نے بے قرار ہو کر پوچھا ــــ "دل اس طرح مُردہ کیوں ہوا جا رہا ہے؟"

دوسرے پھول کی بھی نیند ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے جواب دیا۔ "کیا معلوم مگر بات تو سچی ہے۔ دل جیسے ڈوبا جا رہا ہے۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔"

"اور یہ چاند کی روشنی بھی؟"

"نہیں"۔

دونوں ہی خاموش ہو گئے۔ چلتے چلتے چاند جنگلی بانسوں کی چلمن کے پیچھے مُنہ چھپانے لگا مگر ان کی خاموشی نہ ٹوٹی۔ صبح کی دنیا میں بھی یہ دونوں چُپ چاپ ہی پانی پر تیرتے رہے۔

پانچو اپنے باپ کے ساتھ ایک دن اس نالے کی طرف سے گذرا تھا۔ اس دن بھی اندھیری رات کے بعد اسی طرح تڑکا ہوا تھا۔ آسمان پر بوڑھا چاند اپنی کمر جھکائے کھوئی ہوئی جوانی تلاش کرتے کرتے رُوپوش ہو چکا تھا۔ سپیدۂ سحر کی ملگجی روشنی میں اس نالے کا لبریز پانی چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پدّا پھُول کے سائے تیر رہے تھے۔ اسے گنج ہی میں سارا دن گزارنا تھا۔ اس لئے اگر وہ ان پھُولوں کو توڑ کر رکھ لیتا تو وہ شام تک ضرور سُوکھ جاتے۔ اس لئے اس نے اپنے خواب کی مورتی کو واپسی میں پدّا پھُول کی مالا سے سجانے کا تہیّہ کر لیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ کِسی حسین سحر کے سائے میں وہ ان پھولوں سے اپنا دامن بھر لے گا۔

پانچو نے ایک مرتبہ پانی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مگر ان کے باپ نے جو چپّو چلانے والے کے قریب بیٹھا ہوا تھا اسے ایک ڈانٹ

بتائی —— خبردار! اس میں سانپ ہے. پانچو کو تو صرف دو پھولوں ہی کا لالچ تھا۔ مگر باپ کے خوف سے وہ ان کی طرف ہاتھ نہ بڑھا سکا۔ دل مسوس کر رہ گیا۔ کاش وہ ان دونوں میں سے صرف بڑے پھول ہی کو توڑ کر اپنے شوق کا دامن بھر سکا ہوتا۔

پانچو صبح کو دیہات کی طرف پلٹ آیا تھا۔ پھول توڑ کر اس کی خوشی اپنا دامن سمیٹنا بھول گئی تھی۔ وہ یہ پھول کسے نذر کرے گا؟ اپنے من کی بازی تو وہ پہلے ہی ہار چکا تھا۔

ماں نے کہا تھا —— پانچو اس محلّے کی کُسم بہو آئی ہے۔ پانچو یہ سنتے ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

کمار پاڑے والی کُسم بہو کے ساتھ اس کی ملاقات دو سال پُرانی تھی۔ تب بھی وہ چھوٹی تھی۔ نئی نئی بیاہ کر آئی تھی۔ پانچو کو یہ یاد نہ تھا کہ اس سے ملاقات کی ابتدا کیسے ہوئی تھی۔

اب پُرانے املی کے درخت سے گزر کر وہ تالاب کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ چلتے چلتے اُسے ہنسی آ گئی۔ دو سال پہلے وہ بڑا ہی ڈرپوک لڑکا تھا۔ دن کے وقت بھی اس سایہ دار راستے سے گزرنے میں اُسے خوف محسوس ہوتا۔ لوگوں نے اُس سے کہہ رکھا تھا کہ ان درختوں کی شاخوں پر بھوت اپنا ناچ دکھایا کرتا ہے۔ اور اس کے تصوّر سے وہ

گھر میں بھی نیند سے چونک پڑتا۔ دوپہر کو کمارپاڑے سے گھر لوٹنے تک جب تک کسم بہو اُسے کچھ دُور تک پہنچا نہ جاتی وہ پلٹنے کی ہمّت نہ کر سکتا تھا۔ آج وہ اپنے اُن دِنوں کو بالکل بھول چکا تھا۔ اب وہ انہی درختوں میں "اُولھا پاتی" کھیلا کرتا ہے۔ کھیل ہی کے شوق میں وہ اپنی کشتی چلا کر ایک مرتبہ گنج تک بھی ہو آیا ہے۔ اب اس کے سینے میں ایک نہ ختم ہونے والا حوصلہ ہے۔ ایک اتھاہ ہمّت اور ایک غیرمعمولی بے خوفی۔

اس خوف دلانے والے راستہ پر وہ آج پھر چلا جا رہا تھا۔ وہ ادھر کمارپاڑے میں عرصہ سے گولیاں کھیلنے نہیں آیا ہے۔ اس راستے کے جنگلی بیل بُوٹے سب اس کے جانے پہچانے تھے۔ پُرانے بڑ کے درخت کی جھُولتی ہوئی شاخیں کاٹ دی گئی ہیں۔ اور اونچا ٹیلا سنسان سا معلوم ہوتا ہے۔ سینبھل کی شاخ پر ایک اکیلی فاختہ بیٹھی بے وقت اپنا سُر الاپ رہی ہے۔ پانچو کو یہ چیزیں پسند نہ آئیں۔ مگر آج کی ان خصوصیات میں اور موجودہ فضا کے دُھندلے سائے میں بچپن کی بھولی بِسری باتیں "نقش و نگار طاق نسیاں" کی طرح اُبھرتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ درختوں کی شادابیاں اور رنگارنگ چڑیوں کی اُچھل کُود دیکھ کر فطرت کی دل فریب رنگینیوں میں اس کا دل کھو گیا۔ ہر کیفیت زبانِ قلم کی

منت پذیری نہیں کرسکتی۔ بہت سی چیزیں محسوس کی جا سکتی ہیں لیکن انہیں بیان کرنے کے لئے الفاظ نہیں ملا کرتے۔ کسم بہو کا مکان اب نظروں کے سامنے تھا۔ اور اس کے میدان کا درخت پھولوں سے بھری ہوئی شاخوں کے ہاتھ ہلا ہلا کر اسے اور قریب بُلا رہا تھا۔

کسم بہو کے گھر کے سامنے آکر وہ کھڑا ہو گیا اُسے رُکنا ہی پڑا۔ اس نے دیکھا کہ کسم بہو کا دیور ایک طرف کھڑا زور زور سے رو رہا ہے۔ کسم بہو کی آنکھیں ساون بھادوں ہو رہی ہیں۔ اس کے شوہر نے ایک چھڑی اپنے ہاتھ سے دور پھینک دی تھی۔ شاید وہ اپنی حرکت پر نادم تھا۔ اس کی ننو سارا محلہ اپنے سر پر اٹھاتے ہوئے تھی۔ " ایسی عورت سارا دن کوئی کام نہ کاج، بس نیند اور آرام۔ صبح دس بجے اُٹھنا اور شام کو سویرے ہی سو رہنا۔ شہزادی ہے جبھی نا!"

پانچو ان سب باتوں کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ مگر اس قدر اس نے ضرور سمجھ لیا کہ سب مل کر کسم بہو پر ظلم کر رہے ہیں۔

وہ درخت کے سائے میں آکر کھڑا ہو گیا مگر اس کی موجودگی کسی نے محسوس نہ کی جیسے وہ ناقابل توجہ شخص تھا۔ اسی لئے وہ دیر تک وہاں نہ ٹھہر سکا۔ اس نے سوچا کچھ دیر بعد آنا مناسب ہو گا۔ اس نے نیلوفر کے پھول کی طرف دیکھا اور کہا۔ "لیکن اگر یہ سوکھ گیا!" وہ اس درخت

کے نیچے جسے بھوتوں کا مسکن کہا جاتا تھا بہت دیر تک خوف زدہ حالت میں بیٹھا رہا۔ اس کا دل جیسے ڈوبا جا رہا تھا۔ دور املی کے درخت پر فاختہ اپنا نغمہ الاپ رہی تھی۔ پیلے پنکھ والی چڑیاں بھی اب تک شاخوں پر پھدک رہی تھیں۔

پانچو کو یہ معلوم تھا کہ کسم بہو کا شوہر دوپہر کا کھانا کھا کر اپنی پرچون کی دکان پر چلا جایا کرتا تھا۔ اسی وقت اسے فرصت مل سکے گی اور شاید وہ اس وقت کسم بہو سے دو باتیں بھی کر سکے۔

دن ڈھلے اس نے آکر دیکھا کہ کسم بہو اپنے گھر میں تنہا بیٹھی ہوئی ہے اور آسمان کی طرف معلوم نہیں کیا دیکھ کر کچھ سوچ رہی ہے۔

پانچو نے گھر میں داخل ہوتے ہی کہا "بہو! کیا آسمان کے تارے گن رہی ہو؟" بہو ہنس پڑی پھر ہنسی روکتے ہوئے اس نے کہا "اتنے دنوں سے تم ایک مرتبہ بھی یہاں نہ آسکے؟ بڑے بے مروّت نکلے۔"

"آیا تو تھا مگر اس وقت تمہیں روتا دیکھ کر چلا گیا تھا۔"

بہو نے بڑی شفقت سے پانچو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "دور! کیا میں رو رہی تھی؟ میں بھی کیا کوئی رونی عورت ہوں؟"

"نہیں! تم کہاں روتی ہو۔ افسوس یہ لوگ تمہیں کتنا ستاتے ہیں۔"

پانچو نے فوراً ہی کہا جب یہ لوگ تمہیں مارتے ہیں تو تم بھاگ کر

ہمارے گھر کیوں نہیں چلی آتیں وہاں تمہیں کون مارنے جائے گا؟"

ایسے احمقانہ سوال کا بھلا کیا جواب ہو سکتا تھا۔ مگر پانچو یہ نہ سمجھ سکا۔ کسم بہو اُس کی باتوں پر ہنسنے لگی پھر بولی "بھائی تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے یہ لوگ مجھے ماریں ہی گے۔ اور مجھے اِن کے قدموں میں رہ کر مار کھانی ہی پڑے گی"۔

"کیوں؟ تم یہاں سے اپنے باپ کے ہاں کیوں نہیں چلی جاتیں؟"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ لوگ مجھے وہاں سے نہ لا سکیں گے۔ پھر تو یہ مجھ پر اور زیادہ ظلم کریں گے"۔

"مگر ایک دن تو جان بچی رہے گی۔ اچھا! تم اپنے ماموں کے گھر تو جا سکتی ہو۔ دریا کے اس پار۔ یہاں سے دور۔ کیا نام ہے اُس کا..... ہاں پیرا چالی بانک"۔

"بھائی تم مجھے وہاں پہنچا سکو گے؟ تم تو ابھی بچے ہو"۔

"ضرور پہنچا سکوں گا۔ اچھی طرح پہنچا سکوں گا۔ میں اپنی ہی کشتی لے کر ایک مرتبہ گنج تک ہو آیا ہوں"۔

کسم بہو واقعی رو پڑی۔ زبان سے کچھ نہ کہہ سکی۔ بھلا پانچو اس بھید کو کیا سمجھ سکتا تھا۔ اپنی جنم بھومی سے جدائی کا سوگ اور سسرال والوں کے ظلم نے اُس کے سینے میں دُکھ درد کا کتنا گہرا سمندر پیدا کر دیا

تھا۔ اسے بھلا پانچو کیا سمجھ سکتا تھا۔

کیا کبھی اس سمندر سے پھوٹ پڑنے والے سوتے جو آنکھوں کی راہ اُبل پڑتے تھے خشک ہو سکیں گے؟ اسے کون بتا سکے۔

شام کو واپسی کے وقت پانچو نے کہا۔ "آپا! تم تیار رہنا رات گئے بھور سے بہت پہلے تم گھاٹ پر آجاؤ۔ میں اپنی کشتی میں بٹھا کے تمہیں پہنچا آؤں گا۔ اور دیکھو میرا یہ حقیر تحفہ (پدّا پھول) قبول کر لو۔ اسے پھینک نہ دینا۔ میں نے اسے اپنے گھر نہ رکھا کہ میرے بھائی بہن اسے برباد نہ کر دیں"۔ کسم نے پانچو کا دل رکھنے کے لئے پھول لے لیا۔ بہت رات گئے اس نے گھاٹ پر آ کر دیکھا پانچو جاگ رہا تھا۔ وہ ایک سُبک ڈینگی پر مستعد بیٹھا تھا۔

پانچو نے دبی ہوئی آواز سے کہا۔ "آپا! آجاؤ اب دیر نہ کرو"۔

ندّی پر رات کا اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ دُور دُور تک کچھ نظر نہیں آتا۔ ہر طرف خاموشی۔ ہر جانب سکوت، پانچو نے لگّی سے کشتی کو کھینا شروع کیا۔ دور دور تک چھپ چھپ کی آواز پھیلتی گئی۔ اس موسم میں میدان فصلوں سے خالی تھا۔ اس لئے ندّی کے کنارے والے میدان بھی سنسان پڑے تھے۔ پانچو نے نہ جانے کتنی بار اپنی بے خوف کشتی رانی پر دل ہی دل میں فخر محسوس کیا۔ دُور دُور کے ٹیلوں سے ہوتی ہوئی

پرانے درختوں میں سے فاختہ کی آواز آجاتی تھی۔ پانچو کبھی کبھی بیچ بیچ میں دم لے کر کہتا۔" آپا! وہ سب تو قصائی ہیں۔ معلوم نہیں تمہیں کیوں خواہ مخواہ مارتے ہیں!"

کسم کو آج کوئی خوف نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ایسی سنسان اندھیری رات کو نیلے آسمان کے سائے میں وہ آج تک کبھی گھر سے باہر نہیں آئی تھی۔ ہاں اس نے زندگی میں اپنے باپ کے ساتھ دھان کاٹنے کی فصل میں صبح سویرے میدان کی دنیا ضرور دیکھی تھی۔ مگر وہ دیکھنا اور آج کا دیکھنا دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ پانی کی سطح پر کروٹیں لیتی ہوئی ہوا بے چین دلوں کی گرمی کو بھی ٹھنڈک بخش رہی تھی۔ اور کشتی بھی چلی جارہی تھی۔ اور کسم بہو کو ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی نے پنجرا کھول کر اسے آزادی بخش دی ہو۔ آج پانی کی موجوں اور ہوا کے جھونکوں کی طرح وہ اپنے آپ کو آزاد پا رہی تھی۔

کسم کبھی بھیگی رات کے تاروں کی طرف اور کبھی اندھیری فضا کی طرف نظریں اٹھا کے دیکھتی اور پھر پانچو کی طرف دیکھنے لگتی۔ جو موجوں سے الجھتا، ہواؤں سے لڑتا، اپنی لگی کے بل پر کشتی کھیتا جارہا تھا۔ چھوٹی ندی میں پانی کا زور اتنا زیادہ تھا اور شاید اسی لئے ایک نوعمر لڑکے پر بھی وہ پورا بھروسا کر رہی تھی۔ پھر بھی اس کا

دل بے قرار تھا۔

پانچو کچھ بولتا نہ تھا۔ ہاں! کشتی کو زیادہ سے زیادہ سکون کے ساتھ لئے جانا ہی اُس کا مقصودِ زندگی معلوم ہو رہا تھا۔ ابھی تو اُسے اپنا فرض ادا کرنا تھا۔ رہیں باتیں تو ان کے لئے اس کے پاس بہت وقت پڑا تھا۔

کسم بڑے اطمینان کے ساتھ رات کی تاریکی میں اپنی زندگی کی تاریخ پڑھ رہی تھی۔ وہ اور سوچ بھی کیا سکتی تھی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ دونوں ہی چُپ چاپ تھے۔ پانچو کشتی کھے رہا تھا۔ اور یہی آواز رات کی خاموشی کو چیرتی جاتی تھی۔ کسم کشتی کے دوسری جانب کے سرے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا: "پانچو ذرا ٹھہرو تو۔ دیکھو کوئی ہمارا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے؟"

پانچو نے کہا "نہیں آپا! کوئی بات نہیں"

پانچو نے کشتی روک دی۔ دُور سے چپوؤں کے چلانے کی آواز آ رہی تھی۔ کسم ایک خوف زدہ ہرنی کی طرح اب یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ وہ کیا کرے۔

"کوئی دوسرا ہے آپا!" پانچو نے یہ کہہ کر پھر لگی سے کشتی چلانا شروع کیا۔ آواز قریب تر ہونے لگی۔ چپوؤں کے چلانے کی آواز۔ اب اس کے

شوہر کی آواز بھی کانوں میں آنے لگی۔

پانچو نے کشتی چلانا روک دیا۔ یہیں سے اس نے پھول توڑا تھا۔ اب تک وہ دوسرا پھول پتّوں میں جھول رہا تھا۔ پچھلی صبح کا توڑا ہوا پھول اب تک کسم کے ہاتھوں ہی میں تھا۔ کسم نے شوہر کی آواز سُنی — "اب وہ حیران تھی کہ اپنے مستقبل کو کس ڈگر پر لگائے۔ اس نے ایک ہی لمحے میں اپنا فرض متعیّن کر لیا۔ اس نے کشتی سے چھلانگ لگا دی۔ پانچو کے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی۔ اور کسم کو بچانے کے لئے وہ بھی پانی میں کُود پڑا۔

پانچو تیرنا نہ جانتا تھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ دنیا کی تمام روشنیاں بُجھ رہی ہیں، زمین کی سب ہوائیں گھٹتی جا رہی ہیں۔ اس کے سامنے دوسرے بڑا پھول کی نرم و نازک شاخیں پانی میں کلیلیں کر رہی ہیں۔ اس نے انھیں پکڑنا چاہا مگر وہ ٹوٹ کر اس کے ہاتھوں میں آ رہیں۔ اس نے بے فائدہ پانی میں دو چار بار ہاتھ پاؤں مارے مگر دنیا کی ہوا میں آخری سانس لینے کا موقع بھی پانچو کو نصیب نہ ہو سکا۔

معلوم نہیں پاتال کے دیوتا کیا دیکھ رہے تھے۔ ہاں جَل دیوتا کے محل میں اب دنیا کے دو بچّے سُکھ کی نیند سو رہے تھے۔ دونوں ہی کے ہاتھوں میں ایک ایک بڑا پھول تھا۔ ایک تو مُرجھا چکا مگر دوسرا ابھی

شاداب تھا۔

سورج کی نرم و نازک شعاعوں کی برکت سے یہ دونوں پھول ایک ہی دن شگفتہ ہو کر زندگی کے نور سے جگمگا اُٹھے تھے۔ آج پاتال کی اتھاہ تاریکیوں میں جا کر ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ "کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے؟"

"ہاں! خدا کی مہربانی سے۔"

"ان خاکی پتلوں نے کیا کہا تھا وہ میں نہ سن سکا۔"

اب اوپر پانی کا تلاطم ختم ہو چکا ہے اور رات کی ہوا سن سن کرتی ہوئی اپنی منزل تلاش کر رہی ہے۔

●

(مطبوعہ مشہور پریس۔ کراچی)

ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ کراچی